فلسفہ
معراج النبی ﷺ
ڈاکٹر محمد طاہر القادری
منہاج القرآن پبلیکیشنز

نام کتاب	:	فلسفہ معراج النبی ﷺ
مصنف	:	ڈاکٹر محمد طاہر القادری
ترتیب و تدوین	:	ریاض حسین چوہدری، عبدالستار منہاجین
نظر ثانی	:	محمد معراج الاسلام
پروف ریڈنگ و تخریج	:	عبدالجبار قمر
کمپوزنگ	:	محمد یامین، مقصود احمد
زیرِ اہتمام	:	فریدِ ملت ؒ ریسرچ اِنسٹیٹیوٹ
نگرانِ طباعت	:	محمد جاوید کھٹانہ
مطبع	:	منہاجُ القرآن پرنٹرز
اِشاعت اَوّل تا ہشتم	:	10,600
قیمت	:	-/160 روپے

❁❁❁

نوٹ: ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور خطبات و لیکچرز کے ریکارڈ شدہ آڈیو / ویڈیو کیسٹس اور CDs سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لئے **تحریکِ منہاجُ القرآن** کے لئے وقف ہے۔

(ڈائریکٹر منہاجُ القرآن پبلیکیشنز)

www.MinhajBooks.com
research@minhajbooks.com
ISBN 969-32-0067-5

مَوْلَایَ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَآئِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

مُنَزَّهٌ عَنْ شَرِیْکٍ فِیْ مَحَاسِنِهٖ

فَجَوْهَرُ الْحُسْنِ فِیْهِ غَیْرُ مُنْقَسِمِ

﴿صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَ عَلٰی آلِهٖ وَ أَصْحَابِهٖ وَ بَارِکْ وَسَلِّمْ﴾

فہرست

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
	معجزۂ معراج النبی ﷺ	۱۱
	سفرِ معراج......نقوشِ کفِ پائے مصطفیٰ ﷺ کی چاندنی	
	سفرِ معراج عالم بیداری میں ہوا	
	سفرِ معراج اپنے تین مرحل میں	۱۲
	۱۔ پہلا مرحلہ	
	۲۔ دوسرا مرحلہ	
	۳۔ تیسرا مرحلہ	
	دو کمانوں کا استعارہ	
	ایک لطیف نکتے کی وضاحت	
	تمثیل کا ثقافتی پس منظر	
	مراحل سفرِ معراج	۱۳
	مرحلہ اولیٰ ...... بیت اللہ سے بیت المقدس تک	۱۴
	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قبرِ انور میں نماز ادا کرنا	
	انبیاء صف بہ صف آپ ﷺ کے استقبال کے لئے کھڑے تھے	
	مرحلہ ثانیہ......بیت المقدس سے سدرۃ المنتہیٰ تک	۱۵
	دیدارِ مصطفیٰ ﷺ کے لئے ملائکہ کے ہجوم در ہجوم	
	سدرہ سے آگے یکتا و تنہا	

نمبرشمار	عنوانات	صفحہ
	مرتبہ عروج ونزول	
	پیکر جود و کرم کا احسان عظیم	
۳۰	والنجم اذا ھوٰی کا تیسرا معنی: پورے سفر معراج کی قسم	
	قرآنی قسموں کی حکمتیں	
	قسم اس سرزمین کی جس نے تیرے قدموں کو بوسہ دیا	
۳۱	والنجم اذا ھوٰی کا چوتھا معنی: سفر معراج کی سرعتِ رفتار	
	معجزۂ معراج میں رفتار نبوی کا بیان	
	عظمتِ رفتار مصطفوی ﷺ	
	سفر معراج کی جزئیات کا احاطہ ممکن نہیں	
۳۲	والنجم اذا ھوٰی کا پانچواں معنی: قلب انور وتجلیات الٰہیہ کا مرکز بننا	
۳۳	والنجم اذا ھوٰی کا چھٹا معنی:	
	کائنات کی ہر چیز پر رحمتِ محمدی ﷺ محیط ہے	
۳۴	لفظ ھویٰ کے مختلف معانی	
	ھویٰ کا پہلا معنی: فنا ہونا	
	ھویٰ کا دوسرا معنی: مانند برزخ ہونا	
	رسول کائنات کی تین حیثیتیں	

پیش لفظ

معراج النبی ﷺ تاریخ انسانی کا ایسا حیرت انگیز، انوکھا اور نادر الوقوع واقعہ ہے جس کی تفصیلات پر عقل ناتواں آج بھی حیران اور ششدر ہے۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ یہ سب کچھ کیسے اور کیونکر ہوگیا۔ مادی فلسفہ کی خوگر اور اربعہ عناصر کی بے دام باندی دنیاوی عقل یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ پیکر انسانی ان حدود کو عبور کر کے لامکان کی رفعتوں تک بھی پرواز کرسکتا ہے اور وہ کچھ دیکھ لیتا ہے جسے دیکھنے کی انسانی نظر میں تاب نہیں۔ اس لئے حدود و قیود کے پابند لوگ اس بے مثال عروج و ارتقاء پر بہت حیران ہوتے ہیں اور اسے من وعن اور مستند انداز سے مذکورہ تفصیلات کے ساتھ بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور ایسے ایسے شبہات وارد کرتے ہیں کہ دلائل سے غیر مسلح ذہن اور عام آدمی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

حضرت العلامہ، نابغہ عصر، مفکر اسلام، قائد انقلاب جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلہ کو اللہ پاک نے ہر موضوع پر بات کرنے، اسے سلجھانے اور شکوک وشبہات کو زائل کرنے کا جو خاص ملکہ اور سلیقہ عطا فرمایا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ ضرورت تھی کہ اپنے خاص انداز میں اس موضوع کی طرف توجہ دیں اور اس پر تفصیلی روشنی ڈالیں چنانچہ مخصوص حالات و واقعات میں مختلف مقامات پر انہوں نے اس مقدس واقعہ کے مختلف پہلوؤں کو موضوع سخن بنایا اور علم وحکمت کی شمع فروزاں کرنے کا فریضہ سرانجام دیا اور نہ صرف یہ کہ اہل ایمان کا ایمان تازہ ہوا بلکہ ذہن میں چبھے ہوئے شکوک وشبہات کے کانٹے بھی نکل گئے۔

آپ کے یہ خطابات ابھی تک کتابی شکل میں منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ ان کی بے پناہ افادیت کے پیش نظر ضرورت تھی کہ انہیں جلد از جلد مدون کر کے قارئین کے علمی ذوق کی نذر کیا جائے۔ اس ایمان افروز موضوع پر پروفیسر صاحب کے خطبات کثیر تھے۔ چونکہ قرآن حکیم نے اس واقعہ کو دو سورتوں میں بیان فرمایا اور دونوں جگہوں پر تفصیلات مختلف ہیں اس لئے قارئین کی سہولت کے لئے اس موضوع کو انہی دو سورتوں کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں سورہ

الاسراء اور سورہ النجم کے تحت چند مرتبہ خطبات شامل ہیں۔

تدوین نو کے بعد اب یہ کتابی صوری و معنوی حسن سے آراستہ ہوکر آپ کے ہاتھوں میں ہے، پڑھ کر ہی آپ اس کی افادیت کا انداز لگاسکیں گے لیکن میں اتنا عرض کردوں کہ حضرت محترم قادری صاحب قبلہ مدظلہ نے اس موضوع کے کسی ضروری پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ علم و فضل کی بلندیوں سے جھانک کر ایسے محققانہ اور بصیرت افروز انداز میں روشنی ڈالی ہے کہ دل میں نور عشق امڈ آتا ہے اور تصور کو پر پرواز لگ جاتے ہیں اور وہ خود لامکاں کی رفعتوں میں گم ہوجاتا ہے۔

یہ سائنسی دور ہے جدید اختراعات نے ذہنوں کو اپنے طلسم میں جکڑ رکھا ہے۔ ان کے حوالے سے بات کی جائے تو وہ دلوں میں اتر جاتی ہے اور نئی تعلیم یافتہ پود اسے فوراً تسلیم کرلیتی ہے۔ قائد محترم نے سائنسی نقطہ نظر سے بھی اپنے منفرد انداز میں حقائق کو ایسے اجاگر کیا ہے کہ ذہن آفاقی سچائی کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ یہ موضوع ایک مادہ پرست ذہن کے لئے بھی دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔ یہ واقعہ طی زمان و مکاں کی بھی ایک نادر مثال ہے۔ حضرت قبلہ قادری صاحب نے اس حوالے سے بھی امکان معراج کو ثابت کردیا ہے۔ اس کے علاوہ قربت باری تعالیٰ معراج جسمانی اس پر موافقین و مخالفین کے دلائل، شق سدر، نمازوں مین تخفیف کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو راستہ میں کھڑا کرنے کی حکمت، شرہ عروج و نزول اور اس نوع کے بہت سے علمی پہلو ہیں جو سائنٹیفک اور مدلل انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس موضوع پر یہ کتاب ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے جسے پڑھ کر نہ صرف شکوک و شبہات کا ازالہ ہوتا ہے بلکہ نئی نئی معلومات بھی ملتی ہیں حضور نبی اکرم ﷺ کے مقامات و مرابت کا پتہ چلتا ہے اور نتیجے میں نسبت غلامی استوار ہوتی ہے، محبت بڑھتی ہے جو ایک سچے امتی کی متاع بے بہا ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت قبلہ قادری مدظلہ کو امت کی اس روحانی قیادت و رہنمائی پر اپنی رضا و رحمت عطا فرمائے اور حضور ﷺ کا اور زیادہ فیضان نصیب فرمائے۔ آمین

شیخ الحدیث محمد معراج الاسلام
منہاج انٹرنیشنل یونیورسٹی لاہور

باب اوّل

حقیقتِ معجزہ

فصل اوّل

تفہیمِ معجزہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِس کائناتِ ارض وسماء میں عجائبات کی ایک دُنیا آباد ہے۔ ہرلحہ پھیلتی ہوئی یہ کائنات جو اربوں، کھربوں کہکشاؤں پر مشتمل ہے، وُسعت پذیری کے عمل سے گزرنے کے ساتھ ساتھ داخلی اور خارجی حوالوں سے بھی تغیر پذیر ہے۔ گویا ہر لمحہ تغیرّات کا لمحہ ہے، ہر ساعت نت نئے اِنکشافات کی ساعت ہے۔ اِس کائناتِ رنگ و بو میں خالقِ کائنات کے فرستادہ رسولانِ مکرّم اور اَنبیائے محتشم کے دستِ حق پرست پر قدرتِ خداوندی سے رُونما ہونے والے ماورائے عقل واقعات کو ''**معجزہ**'' کہتے ہیں۔ معجزے کی کاملاً مادّی توجیہہ کسی طور بھی ممکن نہیں۔ اس کا تعلق اِیمان، اِیقان اور وِجدان سے ہوتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی سبک سیر ترقی کے باعث جدید تر سائنسی اِنکشافات قدم قدم پر حیران کن حقائق پر سے پردہ اُٹھا رہے ہیں کہ اِنسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور تصویرِ حیرت بن کر اپنے دامنِ شعور کی تنگی کے اِحساس کا ماتم کرنے لگتی ہے۔ اگرچہ سائنس کائنات کے اَن گنت رازہائے سربستہ سے بھی پردہ اُٹھاتی دِکھائی دیتی ہے لیکن اِس کے باوجود وہ اِن معجزانہ حقائق کی مادّی توجیہات پیش کرنے سے یکسر عاجز ہے جو خالقِ ارض وسماء نے اپنے اَنبیائے محتشم کے دستِ حق پرست پر صادِر فرمائے۔ عقل اُنہیں تسلیم کرے یا نہ کرے یا خود بھی اِشکالات کا شِکار رہو یا ذہنِ اِنسانی کو بھی غبارِ تشکیک سے آلودہ کرے، حقائق بہرحال حقائق ہیں، اُن کے اِنکار سے اُن کی نفی لازِم نہیں آتی۔ اگر ہم غور وفکر اور تدبّر سے مادّے ہی کے اَسرار و رُموز پر سے

پردہ اُٹھائیں تو کائنات میں رُونما ہونے والے محیر العقول واقعات کی توثیق بھی ملتی نظر آتی ہے۔ سائنس جو مادّے کی کائناتی سچائیوں کی تعبیر اور اِنسانی زِندگی میں اُس کے عملی اِطلاق پر مامور ہے، واضح اور روشن زبان میں دراصل عالمِ اَسباب وعلل کے تحت رُونما ہونے والے اُنہی محیر العقول واقعات کی مادّی توجیہہ وتعبیر کا فریضہ سراِنجام دے رہی ہے۔ سائنسدان مادّے کی اِرتقائی صورتوں کے مسلسل مُشاہدے کے ذرِیعے اِس نتیجے پر پہنچتے دِکھائی دے رہے ہیں کہ کوئی تو ہے جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے، وہی خدا ہے۔

سائنس عالمِ اَسباب اور اللہ ربّ العزّت کی طے کردہ فطرت کے قوانین کے مطالعہ کا نام ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے اِن اَلفاظ میں ذِکر کیا ہے:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔

(حم السجدہ، ۴۱:۵۳)

ہم عنقریب اُنہیں دُنیا میں اور خود اُن کی ذات میں (اپنی قدرت وحکمت کی) نشانیاں دِکھائیں گے یہاں تک کہ اُن پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے کہ یہ (قرآن) حق ہے۔

عالمِ اَسباب کو اپنا موضوعِ بحث بنانے والی سائنس عالمِ مافوق الفطرت کے مطالعہ سے تو کجا اُس کی اَبجد کے شعور سے بھی محروم ہے۔ آج جو اَعمال واَفعال ہم اَسباب اِختیار کر کے سراِنجام دیتے ہیں اور اُنہیں سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی کے مظہر قرار دیتے ہیں، اُن میں سے بہت سے اَعمال اَسباب وعِلل کے بغیر سائنسی زبان میں یکسر ناممکن قرار پاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ سائنس اپنے مخصوص دائرۂ کار (عالمِ اسباب) میں مقیّد ہونے کے سبب مادُون الاَسباب اور مافوق الفطرت اَفعال کا سراِنجام دینا تو کجا اُن کی تعبیر وتوجیہہ اور تفہیم وتوثیق کے قابل بھی کسی صورت نہیں ہو

سکتی۔ یہاں اِس اَمر کی وضاحت ضروری ہے کہ معجزہ کسی مادّی تعبیر و تفہیم یا توجیہہ و توثیق کامحتاج نہیں، مقصود صرف اِس اَمر کی نشاندہی ہے کہ جن حقائق کا اِنکشاف حضور رحمتِ عالم ﷺ نے آج سے چودہ سو سال قبل وحیِٔ اِلٰہی اورعلمِ نبوت کی بنیاد پر کیا تھا، آج سائنس اپنے اِرتقائی سفر کے اَن گنت مراحل طے کرنے کے بعداُن حقائق کی اپنی سی جزوی تعبیر وتوجیہہ کرنے کے قابل ہوئی ہے۔ یقیناً اِس بات کا اِمکان موجود ہے کہ سائنس آگے چل کر اپنے موجودہ نظریات سے رُجوع کرلے یا اُن میں ترمیم و اِضافہ کو ضروری گردانے، لیکن ہمارے لئے تاجدارِ کائنات ﷺ کی زبانِ اَقدس سے نکلا ہوا ہر حرف، حرفِ آخر ہےاور یہی ہماری اِیمانیات کا بنیادی پتھر ہے۔

معجزہ کالُغوی مفہوم

لفظِ معجزہ کا مادّۂ اِشتقاق: عَجِزَ، يَعْجَزُ عَجْزًا ہے، جس کے معنی: ’’کسی چیز پر قادِر نہ ہونا‘‘، ’’کسی کام کی طاقت نہ رکھنا‘‘ یا ’’کسی اَمر سے عاجز آ جانا‘‘ وغیرہ ہیں۔ محاورۂ عرب میں کہتے ہیں: عَجِزَ فُلَانٌ عَنِ الْعَمَلِ ’’فُلاں آدمی وہ کام کرنے سے عاجز آ گیا‘‘۔ أی کبر و صار لا يستطيعه فهو عاجزٌ (المنجد: ۴۸۸) یعنی اُس کام کا بجا لانا مشکل بھی ہے اور وہ اُس کام کو کرنے کی اِستعداد بھی نہیں رکھتا...... اُسے رُو بہ عمل لانے کی بنیادی صلاحیت اُس میں موجود نہیں، اِس لئے وہ یہ کام کرنے سے عاجز ہے۔ المفردات میں اِمام راغب اِصفہانی معجزے کامفہوم بیان کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

و العجز أصله التّأخر عن الشئ، و حصوله عند عجز الأمر، أی: مؤخره......و صار فی التّعارف	’’عجز‘‘ کے اصلی معنی کسی چیز سے پیچھے رہ جانے یا اُس کے ایسے وقت میں حاصل ہونے کے ہیں جبکہ اُس کا وقت

إسماً للقصور عن فعل الشئ‘ وھو ضد القدرۃ۔
(المفردات‘ بذیل عجز:۵۴۷)

نکل چکا ہو...... عام طور پر یہ لفظ کسی کام کے کرنے سے قاصر رہ جانے پر بولا جاتا ہے اور یہ ’’القدرۃ‘‘ کی ضد ہے۔

معجزہ کا اِصطلاحی مفہوم

مختلف اَدوار میں اَربابِ علم وفن نے معجزہ کی مختلف تعریفات بیان کی ہیں۔ چند اہم تعریفات یہ ہیں:

۱-أمر خارق العادۃ یعجز البشر عن أن یأتوا بمثلہ۔
(المنجد:۴۸۸)

معجزہ اُس خارقُ العادت چیز کو کہتے ہیں جس کی مِثل لانے سے فردِ بشر عاجز آ جائے۔

۲- قاضی عیاض مالکیؒ فرماتے ہیں:

إعلم أنّ معنٰی تسمیتنا ماجاءت بہ الأنبیاء معجزۃ ھو أن الخلق عجزوا عن الإتیان بمثلھا۔
(الشفاء،۱:۳۴۹)

یہ بات بخوبی جان لینی چاہئے کہ جو کچھ انبیاء علیہم السلام اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں اُسے ہم نے معجزے کا نام اِس لئے دیا ہے کہ مخلوق اُس کی مِثل لانے سے عاجز ہوتی ہے۔

۳- اِمام خازنؒ معجزہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

المعجزۃ مع التحدّی من النبی قائمۃ مقام قول اللہ عزّ و جلّ: ’’صَدَقَ عَبْدِیْ فَأَطِیْعُوْہُ وَ اتَّبِعُوْہُ‘‘ و لأن معجز النبی

معجزہ اللہ کے نبی اور رسول کی طرف سے (جملہ اِنسانوں کے لئے) ایک چیلنج ہوتا ہے اور باری تعالیٰ کے اِس فرمان کا آئینہ دار ہوتا ہے کہ:

شاهدٌ علٰی صدقه فیما یقوله و سُمِّیت المعجزةُ معجزةً لأن الخلق عجزوا عن الإتیانِ بمثلها۔

(تفسیر الخازن، ۲: ۱۲۴)

''میرے بندے نے سچ کہا، پس تم اُس کی (کامل) اِطاعت اور پیروی کرو''۔ اِس لئے کہ نبی و رسول کا معجزہ جو کچھ اُس نے فرمایا ہوتا ہے اُس کی حقّانیت اور صداقت پر دلیلِ ناطق ہوتا ہے اُسے (عرفاً وشرعاً) معجزہ کا نام اِس لئے دیا گیا ہے کہ اُس کی مِثل (نظیر) لانے سے مخلوقِ اِنسانی عاجز ہوتی ہے۔

۴- المعجزة عبارةٌ عن إظهار قدرة اللہ سبحانه و تعالٰی و حکمته علٰی ید نبی مرسل بین أُمّته بحیث یعجز أهل عصره عن إیراد مثلها۔

(معارج النبوة، ۴: ۳۷۷)

معجزہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت اور حکمت کا اُس کے برگزیدہ نبی کے دستِ مبارک پر اِظہار ہے تاکہ وہ اپنی اُمت اور اہلِ زمانہ کو اُس کی مِثل لانے سے عاجز کر دے۔

۵- ابوشکور سالمیؒ نے بھی معجزہ کی بڑی جامع تعریف کی ہے، فرماتے ہیں:

حد المعجزة أن یظهر عقیب السوال و الدّعویٰ ناقضاً للعادة من غیر إستحالة بجمیع الوجوه و یعجز الناس عن إتیان مثله

معجزہ کی تعریف یہ ہے کہ سوال اور دعویٰ کے بعد (اللہ کے رسول اور نبی کے ہاتھ پر) کوئی ایسی خارقِ عادت چیز ظاہر ہو جو ہر حیثیت سے مُحال نہ ہو

بعد التجهد و الإجتهاد إذا كان بهم حذاقة و رزانة فی مثل تلک الصنیعة۔	اور لوگ باوجود کوشش اور تدبیر کے اُس قسم کے معاملات میں پوری فہم و بصیرت رکھتے ہوئے بھی اُس کے مقابلے سے عاجز ہوں۔

(کتاب التمہید فی بیان التوحید از ابوشکور:۱۷)

مندرجہ بالا تعریفات سے یہ بات اظہر مِن الشّمس ہو جاتی ہے کہ

۱۔ معجزہ مِن جانبِ اللہ ہوتا ہے لیکن اُس کا صدُور اللہ کے برگزیدہ نبی اور رسول کے ذریعہ ہوتا ہے۔

۲۔ معجزہ مروّجہ قوانینِ فطرت اور عالمِ اَسباب کے برعکس ہوتا ہے۔

۳۔ معجزہ نبی اور رسول کا ذاتی نہیں بلکہ عطائی فعل ہے اور یہ عطا اللہ ربّ العزّت کی طرف سے ہوتی ہے۔

۴۔ معجزے کا ظہور چونکہ رحمانی اور اُلوہی قوّت سے ہوتا ہے اِس لئے عقلِ اِنسانی اُس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے اور تصویرِ حیرت بن کر سرِتسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ وہ اس کی حقیقت کا اِدراک نہیں کرسکتی۔

اِصطلاحِ معجزہ کی حقیقت

محدّثین، مفسّرین اور مفکّرین نے ہر ہر مسئلہ کے ہر ہر پہلو پر علم و حکمت کے موتی بکھیرے ہیں اور کمالِ عرق ریزی سے اُمور و مسائل کی گتھیاں سُلجھانے کی سعی کی ہے۔ اَربابِ علم و دانش نے اپنے محدود پیرائے میں معجزہ کے بارے میں بھی علمی، فِکری اور اِعتقادی سطح پر حرفِ حق کی تلاش کا سفر جاری رکھا ہے اور تحقیق و جستجو کے محاذ پر دادِ شجاعت دی ہے۔ اِس ضمن میں بعض اہلِ سیر نے لکھا ہے کہ ’’**معجزہ**‘‘ کا لفظ اللہ ربّ العزّت نے قرآنِ مجید میں کسی ایک مقام پر بھی اِستعمال نہیں کیا۔ اِس لئے وہ

اِحتیاطاً معجزات کے بیان اور اُن کے اِثبات کے لئے قرآنی لفظ ''**آیات**'' کا اِستعمال کرتے ہیں۔ یہ اِستعمال یقیناً دُرُست ہے لیکن قرآن کا اُسلوب ہمارے پیشِ نظر رہنا چاہیئے۔ یہ بات ذِہن نشین رہنی چاہئے کہ قرآن اِصطلاحات اور مخصوص اَلفاظ کو بیان نہیں کرتا بلکہ وہ فقط نفسِ مضمون دیتا ہے اور اِیمانیات کے بنیادی تصوّرات سے بحث کرتا ہے۔ بعد اَزاں اہلِ عِلم اُسے اِصطلاحی زبان دے کر ترسیلِ مفہوم کی سعی کرتے ہیں۔ یہی حال تصوّف کا بھی ہے۔ قرآنِ مجید میں تصوف کے لئے لفظ ''تزکیہ'' اور حدیث میں ''اِحسان'' کا لفظ آیا ہے مگر جب وہ باقاعدہ عِلم بنا تو اُسے تصوّف کا نام دیا گیا۔ اِسی طرح دیگر اِصطلاحاتِ علوم تشکیل پذیر ہوئیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ لفظِ آیات میں لفظِ معجزہ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظِ **''آیات''** میں عمومیت ہے جبکہ لفظِ ''**معجزہ**'' میں خصوصیّت ہے۔ لفظِ **''معجزہ''** اصل فعل کے صدُور اور وُقوع کی کیفیّت کو بھی بیان کرتا ہے۔ اِنسان کی ساری ظاہری اور باطنی صلاحیتیں اور قوّتیں معجزہ کے صدُور پر عاجز رہ جاتی ہیں۔

اللہ ربّ العزّت نے قرآن مجید میں اِس فعل کو فقط آیات سے تعبیر نہیں کیا بلکہ متعدّد دُوسرے الفاظ کے ذریعہ بھی اُس کے بنیادی تصوّر کو واضح کیا ہے۔

لفظِ ''آیت'' کا مفہوم

لفظِ آیت کا معنی عموماً نشانی (علامت) لیا جاتا ہے، تاہم یہ لفظ تین معنوں میں اِستعمال ہوتا ہے:

ا- آیت بمعنی قرآن کا جملہ

خدائے بزرگ و برتر نے کفّار و مُشرکین کو کھلا چیلنج دیتے ہوئے فرمایا:

قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَ ادْعُوا آپ فرما دیجئے: ''پھر تم اُس کی مِثل

مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَO	کوئی (ایک) سورت لے آؤ اور (اپنی مدد کے لئے) اللہ کے سِوا جنہیں تم بُلا سکتے ہو بُلا لو، اگر تم سچے ہو‘‘ o
(یونس، ۱۰:۳۸)	

قرآن کے مُنفرد اُسلوب اور غیر متزلزل اِعتماد کی نظیر ممکن ہی نہیں۔ کفّار و مُشرکین اور اُن کے حواریوں کو قرآن کا کھلا چیلنج ہے کہ وہ کوئی ایک سورت یا آیت یا جملہ ہی بنا کر لائیں۔ قرآن بذاتِ خود حضور ختمی المرتبت ﷺ کا ایک دائمی معجزہ ہے اور کسی معجزہ کی مِثال پیش کرنے سے عقلِ اِنسانی عاجز رہتی ہے۔

۲- آیت بمعنیٰ واضح نشانی

قرآن میں آیت کا لفظ واضح نشانی کے معنوں میں بھی اِستعمال ہوا ہے۔ اِمام راغب اِصفہانیؒ نے ’’**المفردات**‘‘ میں لکھا ہے:

هی العلامة الظاهرة و حقيقتهٗ لكل شئ ظاهر هو ملازم لشئ لا يظهر ظهوره۔	اِس کے معنی علامتِ ظاہرہ یعنی واضح علامت کے ہیں۔ دراصل ’’**آیۃ**‘‘ ہر اُس ظاہر شئے کو کہتے ہیں جو دُوسری ایسی شئے کو لازِم ہو جو اُس کی طرح ظاہر نہ ہو۔
(المفردات، بذیل أیّ:۱۰۱)	

اِس معنی کے لحاظ سے اللہ ربّ العزّت نے اِنسان کو مطالعۂ اَنفس و آفاق کی طرف قرآنِ حکیم میں یوں مخاطب کیا ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيَاتِنَا فِيْ الْاٰفَاقِ وَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔	ہم عنقریب انہیں دنیا میں اور خود اُن کی ذات میں اپنی (قدرت و حکمت کی) نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ اُن

(السجدہ، ۴۱:۵۳) پر کھل جائیگا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔

۳- آیت بمعنیٰ خارقِ عادت

آیت کا لفظ قرآنِ حکیم میں خارقِ عادت کے معنوں میں بھی اِستعمال ہوا ہے۔ خارقِ عادت اَیسے خِلافِ معمول اَفعال و واقعات کو کہتے ہیں جو عادتِ جاریہ کے برعکس ہوں اور اَسباب وعِلل کے اِحاطہ و اِدراک میں نہ آ سکیں۔ جیسا کہ اِرشادِ ربّانی ہے:

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللهُ أَوْ تَأْتِيْنَا اٰيَـةٌ۔

(البقرہ، ۲:۱۱۸)

اور جو لوگ علم نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ: ’’اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں فرماتا یا ہمارے پاس (براہِ راست) کوئی نشانی کیوں نہیں آتی‘‘؟

گویا ہمیں ایسے واقعات کیوں نہیں دِکھائے جاتے جو ہماری عقل کو عاجز کر دیں اور ہم اُنہیں دیکھ کر دائرۂ اِیمان میں داخل ہو جائیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کے براہِ راست اُن سے گفتگو کرنے کو یہ اللہ کی نشانیوں یعنی معجزات میں شمار کرتے۔ آیتِ مذکورہ میں اللہ کے نبی سے معجزہ طلب کیا جا رہا ہے۔ باری تعالیٰ سے ہمکلامی خارقِ عادت بات ہے۔

دوسری جگہ اِرشاد فرمایا:

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ أَنْ يَّأْتِيَ بِاٰيَـةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللهِ۔

(المومن، ۴۰:۷۸)

اور کسی رسول کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کوئی نشانی (کوئی آیت، کوئی معجزہ) اللہ کے حکم کے بغیر لے آئے۔

قرآنی اسلوب کی مزید مثالیں

خارقِ عادت واقعات کے لئے کلامِ مجید میں لفظِ ''آیت'' کے علاوہ تین اَلفاظ اور بھی مذکور ہیں:

۱- مُبۡصِرَةٌ

یہ لفظ بھی قرآن میں معجزہ کے معنی میں اِستعمال ہوا ہے، یعنی اَیسی بیّن و واضح نِشانی جو بذاتِ خود اِس طرح ظاہر ہو کہ اُس کے دیکھنے سے دیکھنے والے کی آنکھیں کھل جائیں اور اُس پر حقیقت اپنے تمام تر پہلوؤں کے ساتھ واضح اور رَوشن ہو جائے، تشکیک وشبہات کا غبار چھٹ جائے اور کسی قسم کا اِبہام باقی نہ رہے:

وَ اٰتَيۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَةَ مُبۡصِرَةً۔ (بنی اِسرائیل، ۱۷:۵۹)

اور ہم نے قومِ ثمود کو (صالح علیہ السلام کی) اُونٹنی (کی) کھلی نِشانی دِی تھی۔

قومِ ثمود کی فرمائش پر اُونٹنی کا ظہور ایک معجزہ تھا۔ وہ ایک ایسی اُونٹنی تھی جو اللہ ربّ العزّت کی قدرتِ کاملہ کی آئینہ دار تھی۔

۲- بَيِّنَةٌ

دُوسرا لفظ جو قرآن میں معجزہ کے مفہوم کی وضاحت کے لئے اِستعمال ہوا ہے ''بَيِّنَةٌ'' ہے۔ بینۃ اَیسی کھلی دلیل کو کہتے ہیں جو فریقِ مخالف کو اِنکار کی صورت میں حجت وثبوت کے طور پر پیش کی جائے۔ اِس لحاظ سے اِس کا اِطلاق معجزہ پر بھی ہوتا ہے۔ جب اِس لفظ کے ساتھ آیت کا لفظ بھی آ جائے تو اِس کے معنی کی مزید تائید بھی ہوتی ہے اور اِس مفہوم کو تقویت بھی عطا ہوتی ہے:

قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ بَيِّنَةٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ هٰذِهِ

بیشک تمہارے پاس تمہارے ربّ کی

نَاقَةُ اللّٰہِ لَکُمۡ اٰیَۃٌ۔
(الاعراف، ۷:۷۳)

طرف سے ایک روشن دلیل آ گئی ہے۔ یہ اللہ کی اُونٹنی تمہارے لئے نشانی ہے۔

ایک اور مقام پر اِرشاد فرمایا:

وَ لَقَدۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسٰی تِسۡعَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ۔
(الاسراء، ۱۷:۱۰۱)

اور بیشک ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو نو روشن نشانیاں دیں۔

مذکورہ بالا دونوں آیاتِ کریمہ میں بینۃ اور آیۃ کے اَلفاظ تقدیم و تاخیر کے ساتھ اِستعمال ہوئے ہیں۔ دونوں اَلفاظ معجزہ کے مفہوم کو واضح کر رہے ہیں۔ بینۃ اور آیۃ کے اَلفاظ سے معجزہ کے علاوہ کوئی دُوسرا مفہوم اَخذ نہیں کیا جا سکتا۔

۳- بُرۡھَانٌ

قرآنِ حکیم میں معجزہ کے لئے اِستعمال ہونے والا تیسرا لفظ ''بُرۡھَانٌ'' ہے۔ برھان ایسی دلیل کو کہتے ہیں جو فریقِ مخالف کے تمام دلائل سے زیادہ وزنی اور ان پر حاوی ہو اور کسی تنازعہ کا فیصلہ کر دینے والی ہو:

اُسۡلُکۡ یَدَکَ فِیۡ جَیۡبِکَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ وَّ اضۡمُمۡ اِلَیۡکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّہۡبِ فَذٰنِکَ بُرۡہَانٰنِ مِنۡ رَّبِّکَ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَ مَلَا۠ئِہٖ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِیۡنَ○
(القصص، ۲۸:۳۲)

اپنا ہاتھ اپنے گریبان کے اندر ڈالو (اور پھر نکالو) وہ بِلا کسی عیب (یعنی بیماری وغیرہ) کے سفید (روشن ہو کر) نکل آئے گا اور خوف (کو دُور کرنے) کے لئے اپنے بازو اپنے پہلو سے ملا لیا کرو۔ پس یہ دو دلیلیں (یعنی دو معجزے)

تمہارے ربّ کی طرف سے فرعون اور
اُس کے سرداروں کی طرف ہیں۔ بیشک
وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں o

یہاں قرآنِ حکیم میں معجزہ کے لئے لفظِ برھان اِستعمال ہوا ہے یعنی ایسی دلیل جس کے سامنے کوئی دلیل کام نہ آ سکے۔ یہ ایسی برھانِ قاطعہ تھی جس کے سامنے بنی اِسرائیل کے سارے جادُوگروں کا نشہ ہرن ہوگیا۔ اُن کے طلسم کا حِصار ٹوٹ گیا، اُن کا فنِ جادوگری ناکام ولاجواب ہوگیا اور اُن کی جملہ قوّتیں بےبسی کی تصویر بن کر رہ گئیں۔

خارقِ عادت اَفعال کی اَقسام

اِس کارخانۂ قدرت میں اَن گنت دُنیائیں آباد ہیں۔ اِنسان اَشرفُ المخلوقات ہے لیکن اِس کائنات میں وہ تنہا ہی مخلوقِ خدا نہیں۔ خالقِ کائنات کی مخلوقات کا شمار ممکن ہی نہیں۔ نجانے اِن خلاؤں میں گردش کرنے والے اَربوں کھربوں سیّاروں میں زِندگی کن اَشکال اور کن مراحل میں اِرتقاء پذیر ہے! اگر ہم صرف اِس کرۂ ارضی پر بسنے والی مخلوقات، چرند، پرند، حشرات الاَرض اور آبی مخلوقات کی دُنیاؤں کی سیر کو نکلیں اور اِن مخلوقات کے معمولات کا مُشاہدہ کریں تو صنّاعِ اَزل کی قوّتِ تخلیق کے تصوّر کا ہلکا سا پرتو بھی ذہنِ اِنسانی کی تنگناؤں میں سماتا نظر نہیں آتا۔ اِسی طرح اِس کرۂ ارضی پر خلافِ معمول رُونما ہونے والے واقعات کا تسلسل بھی حیطۂ شعور میں آنا ممکن نہیں، یہ سلسلہ اِس حیرت کدے میں اَزل سے جاری ہے اور اَبد تک جاری رہے گا، البتہ نبوّت کی طرح معجزات کا دروازہ بھی نبیٔ آخرالزّماں ﷺ کی حیاتِ مقدّسہ کے بعد بند ہو چکا ہے۔ واضح رہے کہ تصرّفاتِ حضور ﷺ کا سِلسلہ آج بھی جاری ہے اور

قیامت تک جاری رہے گا کہ قیامت کے دِن بھی آپ ﷺ ہی کے پرچم شفاعت کے سائے تلے اَولادِ آدم کو رِدائے عافیّت نصیب ہوگی۔

اِنسانی زِندگی میں دوطرح کے اَفعال وُقوع پذیر ہوتے ہیں۔ایک وہ اَفعال جومعمول کے مطابق اِنجام پاتے ہیں اور تھوڑا سا غور وفکر کرنے سے اُن کی توجیہہ ممکن ہوتی ہے۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں ان افعال و واقعات کی اَن گِنت مثالیں پائی جاتی ہیں جیسے کسی شخص کا بیماری کی وجہ سے فوت ہو جانا۔ دُوسرے وہ اَفعال جومعمول سے ہٹ کر بلکہ خلافِ معمول ہوتے ہیں اور اُن کی کامل توجیہہ کسی طور پر بھی ممکن نہیں ہوتی۔ اُنہیں خارقِ عادت اَفعال کہا جاتا ہے۔ یہ خلافِ معمول واقعات مختلف لوگوں سے مختلف شکلوں میں صادِر ہوتے ہیں۔ ان خلافِ معمول واقعات کو چار مختلف اَقسام میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ معجزہ
۲۔ اِرھاص
۳۔ کرامت
۴۔ اِستدراج

۱۔ معجزہ

جب کسی نبی اور رسول کو خِلعتِ نبوّت و رِسالت سے سرفراز کیا جاتا تو کفّار و مُشرکین دعوائے نبوّت کی صداقت کے طور پر اُس سے دلیل طلب کرتے۔ اِس پر قدرتِ خداوندی سے جو خارقِ عادت واقعہ اُس نبی یا رسول کے دستِ حق پرست سے صادِر ہوتا اُسے معجزہ کہتے ہیں۔

۲-اِرھاص

وہ خلافِ معمول واقعات یا عجائبات جن کا ظہور کسی نبی یا رسول کی وِلادتِ باسعادت کے وقت یا پیدائشِ مبارکہ سے پہلے ہوتا، اِرھاص کہلاتے ہیں۔ اُن واقعات کا رُونما ہونا اِس اَمر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ پیدائش ایک غیرمعمولی پیدائش ہے۔ مثلاً حضور رحمتِ عالم ﷺ کی وِلادتِ پاک سے پہلے دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آسمان سے سِتارے سائبان کی طرح زمین پر اُتر آئے ہیں اور کعبہ کے بت سجدہ ریز ہو گئے ہیں۔ سیدۂ کائنات بی بی آمنہؓ کا اِرشادِ گرامی ہے کہ سرکار ﷺ کی تشریف آوری کے وقت میں نے سرزمینِ مکہ سے ہزاروں میل کے بُعد پر واقع شام کے محلات دیکھے اور یہ کہ میں نے اپنے اِردگرد خوشبوئیں محسوس کیں۔ کفّار و مشرکینِ مکہ چونکہ لڑکیوں کو زِندہ درگور کر دیتے تھے اِس لئے اِس ظلم کے مستقل خاتمے کی علامت کے طور پر جس سال سرورِ کائنات ﷺ کی ولادتِ باسعادت ہوئی، اُس سال شہرِ مکہ میں کوئی لڑکی پیدا نہ ہوئی۔ آمدِ مصطفیٰ ﷺ کے صدقے میں ربِّ کائنات نے سب کو فرزند عطا فرمائے۔ گویا کارکنانِ قضا و قدر زبانِ حال سے اِعلان کر رہے تھے کہ والئ کون و مکاں ﷺ کی تشریف آوری کسی عام اِنسان کی آمد نہیں۔ یہ تمام خارقِ عادت واقعات اِرھاص کہلاتے ہیں۔

۳- کرامت

کرامت اُن خارقِ عادت اَفعال کو کہتے ہیں جو مومنین، صالحین اور اولیائے کرام کے ہاتھوں سے صادِر ہوتے ہیں۔ تاریخِ اِسلام اَولیاء و صوفیاء کی کرامات سے بھری پڑی ہے۔ مثلاً سیدنا سلیمان علیہ السلام کے صحابی حضرت آصف برخیا کا پلک جھپکنے

سے قبل ملکۂ سبا کا تخت آپ کی خدمت میں پیش کر دینا، امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا دورانِ خطبہ منبر پر ہی میدانِ جنگ کا مشاہدہ کرنا اور لشکرِ اسلام کے سپہ سالار کو عسکری ہدایات دینا اور حضرت خواجۂ اجمیرؒ کے ہاتھ پر لاکھوں ہندوؤں کا قبولِ اِسلام اُن کی کراماتِ جلیلہ میں سے ہے۔

۴- اِستدراج

یہ وہ خلافِ عادت اَفعال ہوتے ہیں جو کسی کافر، مُشرک، فاسق، فاجر اور ساحر کے ہاتھ سے صادِر ہوں۔ مثلاً: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عدم موجودگی میں سامری جادوگر نے سونے کا بچھڑا بنا کر اُس کے منہ سے آواز پیدا کر لی جس کے نتیجے میں بنی اِسرائیل نے اُس کی پرستش شروع کر دی۔ اِسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دعوائے نبوّت کو چیلنج کرتے ہوئے فِرعون کے دربار میں جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں زمین پر پھینکیں تو وہ اَژدھا بن گئیں۔ اِس قبیل کے تمام اَعمال اِستدراج کی ذیل میں آتے ہیں۔

حقیقتِ معجزہ

جہاں عقل عاجز آ جاتی ہے وہاں سے معجزے کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ معجزہ ربِّ کائنات کی قدرت اور جلالت کا اِظہار ہوتا ہے۔ یہ وہ خارقِ عادت واقعات ہوتے ہیں جو اللہ کے برگزیدہ نبیوں اور رسولوں سے صادِر ہوتے ہیں۔ اُن کا بظاہر کوئی سبب نظر آتا ہے اور نہ کوئی اُن کی علّت دِکھائی دیتی ہے۔ یہ عقل کے دائرۂ اِدراک اور حیطۂ شعور میں نہیں آتے، لیکن جب اِنسان اپنے سر کی آنکھوں سے اُن کا ظہور ہوتے دیکھتا ہے تو سرِ تسلیم خم کرنے کے سِوا اُس کے پاس کوئی چارہ نہیں رہتا اور وہ کہہ اُٹھتا ہے

کہ یہ معجزہ اللہ کے نبی سے صادِر ہوا ہے، اِس لئے یہ حق ہے۔ وہ لوگ جو معجزات و کرامات کے ردّ و قبول کا مِعیار اپنی سوچ، عقل، تجربہ اور مطالعہ کو قرار دیتے ہیں نہ صرف بہت بڑے اِعتقادی مغالطے کا شکار ہو جاتے ہیں بلکہ علم کے تکبّر میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اگر لکڑی آگ کے الاؤ میں گر کر جلا نہ کرے تو عقل کبھی بھی ذہنِ اِنسانی کی یہ رہنمائی نہ کرے کہ آگ جلانے والی شئے ہے۔ اِس لئے کہ جو بات مُشاہدہ اور تجربہ کے خِلاف ہو عقل اُسے ہرگز ہرگز تسلیم نہیں کرتی۔ مثلاً: اللہ کے برگزیدہ نبی سیدنا اِبراھیم علیہ السلام بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑیں اور آگ گلزار بن جائے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام **قُمْ بِإِذْنِ اللهِ** کہیں تو قبر سے مُردہ اُٹھ کھڑا ہو، حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیض اپنی آنکھوں سے لگائیں تو آپ علیہ السلام کی بِینائی لوٹ آئے، حضرت صالح علیہ السلام پہاڑ پر اپنی چھڑی مبارک ماریں تو اُس کے اندر سے اُونٹنی برآمد ہو جائے، حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک درباری پلک جھپکنے سے پہلے اور جسم کو غائب کئے بغیر ہزاروں میل دُور سے ملکہ بلقیس کا تخت لا کر حاضر کر دے یا پھر انگشتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُٹھے اور چاند دو ٹکڑے ہو جائے، ڈوبتے سورج کی سمت دستِ اَقدس اُٹھائیں تو وہ غروب ہونے کے بعد واپس لوٹ آئے اور آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمِ اَطہر کے لمس سے کھجور کا مرا ہوا درخت پھر سے زِندہ ہو جائے تو عقل اپنے دامنِ شعور کو تار تار نہیں کرے گی تو اور کیا کرے گی! ورائے عقل سرزد ہونے والے اِنہی واقعات کو معجزہ کہتے ہیں۔ عقل اِن معجزات کو سمجھنے سے معذور ہے۔

فصل دوم

ضرورتِ معجزہ

قبولِ حق اور انسانی فطرت

کشورِ اِیمان و اِیقان تسلیم و رضا کی خوئے دِلنواز سے آباد ہے، لیکن حق و صداقت کو قبول کرنا عقلی اور رُوحانی دونوں حوالوں سے اِنسان کا بنیادی مسئلہ رہا ہے۔ عقل و شعور کے سارے دائرے اِنسان کے اِسی بنیادی مسئلے کی ماہیّت اور اصلیّت کو سمجھنے کے لئے مصروفِ عمل ہیں۔ تاریخِ اِرتقائے نسلِ اِنسانی اِس اَمر کی شاہد عادل ہے کہ حق و صداقت کو قبول و تسلیم کرنے کے حوالے سے اِنسانی فطرت ہمیشہ دو طریقوں سے مانوس رہی ہے۔ ایک یہ کہ مدّعیِ حق کی صداقت اور حقّانیت دلائل و براہین کے ذرِیعہ ثابت ہو جائے اور ذہنِ اِنسانی اُسے دِل و جان سے قبول کر لے۔ دُوسرا یہ کہ دلائل و براہین کے ساتھ ساتھ عقلی بنیادوں کے علاوہ اِذنِ اِلٰہی سے اللہ کے نبی یا اُس کے رسول کے دستِ اَقدس سے ایسے عجیب اور حیرت انگیز اُمور صادِر ہوں جو عام قوانینِ قدرت کے تابع ہوں اور نہ ظاہری اَسباب و عِلل ہی کے محتاج، حتیٰ کہ اُن کا تعلق اِکتسابِ علم و فن سے بھی نہ ہو۔ عوام و خواص اُن کے مقابلے میں نہ صرف عاجز آ جائیں بلکہ اَسباب و عِلل کے دائرے میں رہتے ہوئے اُن کی تخلیق و اِیجاد سے بھی کلیتًا بے بس ہو جائیں۔

پہلے طریق کے ساتھ دُوسرا طریق اِنسانی عقل و فکر اور ہوش و تدبیر کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ داعیِ حق (نبی یا رسول) کا یہ فعل ہرگز ہرگز اُس کا ذاتی فعل نہیں بلکہ

اِس واقعہ کے پس منظر میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کارفرما ہے۔ اِس حقیقت کو قرآنِ مجید نے اِن اَلفاظ میں بیان کیا ہے:

وَ مَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ○ (الانفال، ۸:۱۷)

(اے حبیبِ محتشم!) جب آپ نے (اُن پر سنگریزے) مارے تھے (وہ) آپ نے نہیں مارے تھے بلکہ (وہ تو) اللہ نے مارے تھے ○

فرمایا جارہا ہے کہ: ''اے حبیب! یہ فعل آپ کا نہ تھا بلکہ ہمارا تھا۔ آپ کے دُشمنوں پر خاک آپ نے نہیں ہم نے پھینکی تھی''۔ دُوسرے لفظوں میں اللہ معجزے کے ذرِیعے اپنے نبی کا دِفاع بھی کرتا ہے اور اُس کی عظمت کا سِکّہ بھی اِنحراف کرنے اور قبول کرنے والوں کے دِلوں پر بٹھاتا ہے۔

قبولِ حق کے دو گروہ

مذکورہ دونوں طریق کی قبولیّت کے حوالے سے دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ پہلا گروہ اُن اَصحابِ علم و دانش پر مشتمل ہے جو اُمور و مسائل پر غور و فکر کرنے اور سوچنے سمجھنے میں اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ اُن کے نزدِیک قبولیّت کا پہلا طریق زیادہ مؤثر اور کارگر ہے، جبکہ دُوسرے طریق کو وہ پہلے کی تائید و تصدیق کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں۔ دعویٰ نبوّت کی صداقت پر عملی دلیل دیکھنے سے اُن کے یقین میں اِضافہ ہوتا ہے اور وہ بلا تامّل دائرۂ اِیمان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ دُوسرا گروہ اُن اَربابِ قوّت و اِقتدار اور عام اِنسانوں پر مشتمل ہے جو عجائب سے متاثر ہوتے ہیں۔ محیرالعقول واقعات سے اَثر پذیری اُن کے مِزاج کا حصّہ ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے طریقِ ثانی زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔ جب یہ لوگ اللہ کے برگزیدہ نبی اور رسول

کے معجزانہ اَفعال کا کھلی آنکھوں سے مُشاہدہ کرتے ہیں اور اُنہیں قوانینِ قدرت اور ظاہری اَسباب و عِلل سے ماوراء دیکھتے ہیں تو وہ یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ نبی یا رسول کے اُس معجزانہ فعل میں اللہ کا اِرادہ ضرور کارفرما ہے۔ یہ اُسی کی قدرتِ کاملہ سے ظہور پذیر ہو رہا ہے جو ہر چیز پر قادِر اور اِس کائناتِ رنگ و بو کا خالق و مالک ہے۔ یوں وہ اُس معجزے کو ''**آیة اللہ**'' تصوّر کرتے ہوئے دِل و جان سے قبول کر لیتے ہیں۔ قرآنِ حکیم فرقانِ مجید نے اکثر مقامات پر پہلے طریق ہی کو ''**حجة اللہ**''، ''**برھان**'' اور ''**حکمة**'' کے اَلفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ اَنعام میں اِسلام کے بنیادی عقائد بیان کرنے کے بعد فرمایا:

قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ۔ (الانعام، ۶:۱۴۹)

فرما دیجئے کہ دلیلِ محکم تو اللہ ہی کی ہے۔

ایک دُوسرے مقام پر سیدنا حضرت اِبراہیم علیہ السلام کے تذکرے میں فرمایا:

وَ تِلْكَ حُجَّتُنَا اٰتَيْنٰهَا إِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ۔ (الانعام، ۶:۸۳)

اور یہی ہماری (توحید کی) دلیل تھی جو ہم نے اِبراہیم علیہ السلام کو اپنی (مخالف) قوم کے مقابلہ میں دی تھی۔

نبیوں اور رسولوں کے حوالے سے ایک اور مقام پر اِرشادِ باری تعالیٰ ہے:

رُسُلاً مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ۔ (النساء، ۴:۱۶۵)

رسول جو خوشخبری دینے والے اور ڈر سنانے والے تھے (اِس لئے بھیجے گئے) تاکہ (اُن) پیغمبروں (کے آ جانے) کے بعد لوگوں کے لئے اللہ پر کوئی عذر باقی نہ رہے۔

سورۂ نساء میں ہی ایک اور مقام پر فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔

(النساء، ۴:۱۷۴)

اے لوگو! بے شک تمہارے پاس تمہارے ربّ کی جانب سے (ذاتِ محمدی ﷺ کی صورت میں ذاتِ حق جل مجدہٗ کی سب سے مضبوط، کامل اور واضح) دلیلِ قاطع آ گئی ہے۔

سورۂ یوسف میں فرمایا:

لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ۔

(یوسف، ۱۲:۲۴)

اگر اُنہوں نے اپنے ربّ کی روشن دلیل کو نہ دیکھا ہوتا۔

سورۂ نحل میں فرمایا:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ۔

(النحل، ۱۶:۱۲۵)

(اے رسولِ معظم!) آپ اپنے ربّ کی راہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلایئے اور اُن سے بحث (بھی) ایسے اَنداز سے کیجئے جو نہایت حسین ہو۔

سورۂ نساء ہی میں ایک اور مقام پر اِرشاد فرمایا:

وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ۔

(النساء، ۴:۱۱۳)

اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی ہے۔

قرآن کے کائناتی اُسلوب کا ایک مُنفرد وصف یہ بھی ہے کہ اُس میں گنجلک سے گنجلک مسئلہ بھی کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے تاکہ ذہنِ اِنسانی پر ہر مسئلہ اور مسئلے کا ہر پہلو روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں دُوسرے طریقِ دلیل کو

اکثر آیۃُ اللہ یا آیاتُ اللہ اور بعض مقامات پر آیاتِ بیّنات یا صرف بیّنات کے اَلفاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کی اُونٹنی کے بارے میں فرمایا:

قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَـةً۔ (الاعراف، ۷۳:۷)	بیشک تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے ایک روشن دلیل آ گئی ہے۔ یہ اللہ کی اُونٹنی تمہارے لئے نشانی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذِکر کرتے ہوئے بیان فرمایا:

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنَاتٍ۔ (بنی اِسرائیل، ۱۰۱:۱۷)	اور بے شک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نو روشن نشانیاں دیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کی والدہ ماجدہ حضرت مریم علیہا السلام کا ذِکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَ جَعَلْنٰهَا وَ ابْنَهَا اٰيَـةً لِّلْعَالَمِيْنَ○ (الانبیاء، ۹۱:۲۱)	اور ہم نے اُسے اور اُس کے بیٹے (عیسیٰ) کو جہان والوں کے لئے (اپنی قدرت کی) نشانی بنا دیا○

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے حوالے سے فرمایا:

اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ○ (المائدہ، ۱۱۰:۵)	جب تم اُن کے پاس واضح نشانیاں لے کر آئے تو اُن میں سے کافروں نے (یہ) کہہ دیا کہ: ''یہ تو کھلے جادُو کے سِوا کچھ نہیں''○

سورۂ بقرہ میں اِرشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ۔ (البقرہ،۲:۲۵۳)

اور ہم نے مریم کے فرزند عیسیٰ (علیہ السلام) کو واضح نشانیاں عطا کیں۔

معجزہ پیغمبرانہ جلال کا آئینہ دار ہوتا ہے

بلاشبہ باری تعالیٰ نے ہر دَور میں اپنے برگزیدہ نبیوں اور رسولوں کو آیات و معجزات سے نوازا کیونکہ اللہ ربّ العزّت کو اپنے اُن مقرّب نبیوں اور رسولوں کی عظمت کا اِظہار مقصود تھا کہ لوگ اُنہیں اِحترام اور تقدّس کی نگاہ سے دیکھیں۔ ساری کائناتِ اِنسانی ہر دَور میں معجزاتِ انبیاء علیھم السلام کے سامنے بے بسی اور عاجزی کی تصویر بنی رہی۔ اللہ کے نبیوں اور رسولوں کو اگرچہ اِبتلاء و آزمائش کے اَن گنت مراحل سے گزرنا پڑا، اِعلانِ حق پر باطل اپنے تمام تر مادّی وسائل کے ساتھ حرکت میں آتا اور روشنی کی راہ میں دِیوار بننے کی کوشش کرتا رہا، ذِہنوں میں فتنے پرورش پاتے رہے، سازشیں تیار ہوتی رہیں، اکثر و بیشتر اُن مقرّبانِ خدا کو مرحلۂ ہجرت سے بھی گزرنا پڑا، تاہم اُن کے منصبِ رسالت و نبوّت کے گرد جلال و جمال کا ہالہ پوری آب و تاب کے ساتھ روشن رہا اور کفر اپنی تمام تر مخالفتوں اور چیرہ دستیوں کے باوجود اُن پیکرانِ وفا کو جھٹلانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کفّار و مشرکین پیغمبرانہ جلال اور معجزات کے ظہور کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں۔ عقل و خرد ہر دَور میں متعجب و حیران ہوئی، کبھی تسلیم کرنے کے لئے آگے بڑھی اور کبھی اِنکار پر اُتر آئی، کبھی زبانیں تعصّب کے زہر سے آلودہ ہو کر سحر سحر کا راگ الاپنے لگیں اور کبھی غرور و تکبر اور گھمنڈ قبولِ حق کی راہ میں آن کھڑا ہوا۔ دِل اِقرار اور زبانیں اِنکار کرتی رہیں۔ چونکہ معجزہ ایک اَبدی حقیقت ہے اِس لئے قبولِ حق سے اِنکار کے باوجود اُسے دِل سے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

عطائے ربِّ جلیل

مقصد، ضرورت اور افادیت ہی ارض و سماوات کی تمام تر گردشوں کا مرکز و محور ہے۔ خالقِ کائنات نے کوئی چیز بھی مقصد کے بغیر پیدا نہیں کی، یہ الگ بات کہ ہماری عقل کسی چیز کی غایتِ تخلیق کے تمام تر پہلوؤں کا اِحاطہ کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ اَب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ضرورتِ معجزہ کیا ہے؟ عقل کو عاجز کر دینے والے واقعات اور مشاہدات کے ظہور سے کیا مقصود ہے؟ دوسرے لفظوں میں منزلِ حق کے لئے ہدایتِ آسمانی کے فروغ میں اور نبی یا رسول کی عظمت وفضیلت کے اِظہار میں معجزے کی اَہمیت و اِفادیّت کیا ہے؟ نبی اور رسول کی بعثت کا مقصد کائناتِ انسانی کی رُشد و ہدایت اور خیر و فلاح ہوتا ہے۔ اَنبیاء و رُسل وحیٔ اِلٰہی کے ذریعہ ہدایاتِ خداوندی وُصول کر کے اپنے فرائضِ منصبی اَدا کرتے ہیں اور علم و برہان اور محبتِ حق کے ذریعہ اللہ کی وحدانیّت اور اپنے مشن کی صداقت و حقّانیت کا یقین دلاتے ہیں۔ وہ ہرگز ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ فطرت اور ماورائے فطرت اُمور میں تصرّف اور تغیر کی مُستقل بالذّات قدرت رکھتے ہیں۔ یہ معجزات خدائے دو جہاں کی قدرتِ کاملہ کے مظہر ہوتے ہیں۔ انبیاء بارہا یہ اِعلان کرتے ہیں کہ وہ اللہ ربّ العزّت کی طرف سے بشیر و نذیر اور داعی اِلیٰ اللہ بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

تاریخِ اِنسانی گواہ ہے کہ جب اللہ کا نبی یا اُس کا رسول اپنی نبوّت کا اِعلان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ منصبِ نبوت یا منصبِ رسالت پر مامور مِن اللہ ہے، یعنی یہ منصب اُسے ربِّ کائنات نے عطا کیا ہے تو اُس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ یہ منصب اُسے عِبادات و مجاہدات اور نیک اَفعال و اَعمال کے صلے میں عطا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ منصب محض عطائے اِلٰہی سے حاصل ہوتا ہے۔ نبی یا رسول اُس عظیم

منصب پر فائز ہوکر اِنسانوں کی رَہنمائی کا فریضہ سر انجام دیتا ہے اور اِنسان کے مقصدِ تخلیق کا اِحیاء کرتا ہے، فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کرتا ہے اور اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ معاشرے میں آسمانی ہدایت کے نِفاذ کی بھرپور سعی کرتا ہے، اپنی جدّوجہد کو نتیجہ خیز بناتا ہے اور کرۂ ارضی پر پُر امن معاشرے کے قیام کے بعد اُس کی کامیابی کو ہدایتِ آسمانی کی روشنی میں اپنا راستہ متعین کرنے سے مشروط کرتا ہے۔

ضرورتِ معجزہ

۱۔ اِنسانی ذِہن اِس طرف متوجہ ہوسکتا ہے کہ اگر اُس نبی یا رسول کا دعویٰ نبوّت و رِسالت صحت پر مبنی ہے تو اُس نبی یا رسول کو اللہ کے حضور یقیناً ایسا مقامِ قُرب حاصل ہو گا جو عام اِنسانوں کو میسّر نہیں ہوسکتا۔

۲۔ تاریخ شاہد عادل ہے کہ اللہ کے نبیوں اور رسولوں کی دَعوت و تبلیغ سے باطل کے اَیوان لرز اُٹھتے اور فرسودہ نظام کی دِیواروں میں دراڑیں پڑ جاتیں، ظالمانہ رسم و رواج اور عقائدِ باطلہ کے خلاف صدائے اِحتجاج بلند کرنا اور پھر باطل کے ہر نشان کو مِٹانے کے لئے عملاً میدانِ کارزار میں سینہ سپر ہونا اور اپنے وقت کی باطل اِستحصالی قوّتوں کو للکارنا اُن برگزیدہ ہستیوں کے کارِ نبوّت میں سرِفہرست رہا ہے۔

۳۔ ذِہنِ اِنسانی میں اُبھرنے والے اَن گنت شکوک و شبہات کا اِزالہ معجزے کے ظہور سے ہوتا ہے۔ یہ اللہ اور اُس کے نبی کے درمیان ایک رُوحانی واسطہ اور رابطہ کی علامت بھی ہے۔ اللہ کے نبیوں اور رسولوں سے ماورائے فِطرت اور خارقِ عادت اُمور کا صدُور اُن کے دعویٰ نبوّت کا ثبوت بھی ہے۔ معجزات دراصل قربِ اِلٰہی کی نشانی اور تائیدِ غیبی کے مظہر ہوتے ہیں۔

۴- اَنبوہِ اَولادِ آدم میں ایسے گروہ اور طبقات بھی ہوتے ہیں جو خود بھی نشۂ اِقتدار وقوّت میں مُبتلا ہوتے ہیں اور زبان بھی اِقتدار اور قوّت ہی کی سمجھتے ہیں۔ اُن پر کوئی اَمرِ حق اُس وقت تک مؤثر نہیں ہوتا جب تک اُن کے تکبّر اور رعونت کو غیبی ٹھوکر سے جگایا نہ جائے اور اُن کے شعور کو فطرت کے جلال و جمال کے مظاہروں سے بیدار نہ کیا جائے۔ وہ اِس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ اللہ کے پیغمبر کے دستِ حق پرست پر کوئی اَیسا معجزہ صادِر ہو یا عقل کو عاجز کر دینے والے اَیسے اَمر کا ظہور ہو جس کے بعد اُس پیغمبر کی صداقت اور حقّانیت کو جھٹلانے کا اُن کے پاس کوئی جواز باقی نہ رہے اور اُن کو یقین ہو جائے کہ وہ واقعی اللہ کے پیغمبر ہیں اور ربِّ کائنات نے بغیر اَسباب وعِلل کے اُنہیں یہ عظیم معجزہ عطا فرمایا ہے۔ وہ قادرِ مطلق یقیناً ہر لحہ اپنے نبی کی دستگیری کر رہا ہے۔ اُس نبی کو اپنے خالق کی ہر آن تائیدِ غیبی حاصل ہے۔

دعوائے نبوت اور معجزہ کا باہمی تعلق

متکلمین نے دعویٔ نبوّت اور معجزہ کے مابین تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے یہ مثال بیان کی ہے کہ جب کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ فلاں بادشاہ نے اُسے اپنا نائب مقرّر کر کے بھیجا ہے تو اُس علاقے کے لوگ قدرتی طور پر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ مُدّعیٔ نیابت اپنے دعویٰ کی صداقت میں کوئی سند یا علامت پیش کرے، اُنہیں شاہی فرمان دِکھائے تاکہ وہ مطمئن ہو کر اُسے اپنا حاکم تسلیم کر لیں۔ اُس کی حاکمیّت کو تسلیم کرنا دراصل بادشاہ کی حاکمیّت کے سامنے گردن جُھکانا ہے، جس کا وہ نمائندہ ہوتا۔ کسی نبی یا رسول پر اِیمان لانا یا اُس کے دستِ حق پرست سے کسی معجزے کو رُونما ہوتے دیکھ کر اُس کی صداقت پر اِیمان لانا دراصل اُس قادرِ مطلق کی توحید پر اِیمان لانا ہے جس کی قدرتِ کاملہ سے اُس نبی سے یہ معجزہ صادِر ہو رہا ہے۔ یا یوں کہئے کہ مُدّعیٔ نیابت ایک

طرف لوگوں کو اگر اپنی سند دِکھاتا ہے تو دُوسری طرف اُنہیں اپنی کسی خاص نشانی کا مُشاہدہ بھی کراتا ہے تاکہ دیکھنے والی آنکھ کو یہ یقین حاصل ہو جائے کہ یہ شاہی نِشانی بادشاہ کی توثیق کی مظہر ہے۔ بادشاہ کی اَنگشتری (مہرِ حکومت) اُس شخص کو مل سکتی ہے جس کو بادشاہ اپنی نیابت کے اِعزاز سے سرفراز کرے۔

معجزہ اُس عظیم ہستی کے ہاتھوں سے صادِر ہوتا ہے جسے منصبِ نبوّت و رِسالت پر فائز کیا گیا ہو۔ معجزہ کا صدُور اللہ کے نبی اور رسول ہی سے **ممکن** ہے۔ معجزہ کسی غیرِ نبی سے صادِر نہیں ہوتا۔ معجزہ **''آیتِ اِلٰہی''** ہوتا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اُس کا ظہور اُسی پروردگار کے اِذن سے اَنبیاء و رُسل سے صادِر ہوتا ہے۔ اُن سے معجزے کا مطالبہ یا تو تلاشِ حق کے لئے ہوتا ہے کہ معجزے کا ظہور دیکھ کر دولتِ اِیمان نصیب ہو یا پھر یہ مطالبہ محض تعصّب، حسد اور بُغض کی بناء پر ہوتا ہے تاکہ مُنحرفین اور مُنکرین بزعمِ خویش معجزے کی عدم دستیابی کی صورت میں اللہ کے برگزیدہ رسول کو جُھٹلا سکیں، یہی وجہ ہے کہ صدورِ معجزہ کی صورت میں معجزہ دیکھ کر بھی وہ اِیمان کی روشنی سے محروم رہتے ہیں۔ اُن کے تعصّب، حسد اور بغض میں اِنکار کا مزید عنصر داخل ہو جاتا ہے اور اُن کے دِلوں پر قُفل پڑ جاتے ہیں جبکہ سعید رُوحیں معجزے کو دیکھ کر پُکار اُٹھتی ہیں:

اٰمَنَّا بِرَبِّ هَارُوْنَ وَ مُوْسٰی۔ ہم ہارون اور موسیٰ کے ربّ پر اِیمان لے آئے۔

(طٰہ، ۲۰:۷۰)

اس کے برعکس بد بخت اور دولتِ اِیمان و اِیقان سے محروم رُوحیں عِناد و دُشمنی کی تارِیکی میں ڈوب کر کہتی ہیں:

إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌO یہ صریح جادو کے سِوا (کچھ) نہیں o

(الانعام، ۶:۷)

عقل والے سوچتے رہ جاتے ہیں اور عشق والے جُھک کر اَوجِ ثریا کو پا لیتے ہیں اور بامِ فلک کو چھو لیتے ہیں۔ اِقرارِ نبوّت بذاتِ خود ایک بہت بڑا اِعزاز ہے، اِس اِقرار کے سامنے سب اِقرار ہیچ ہیں کیونکہ اِس اِقرار کی بدولت دِین بھی ملتا ہے اور دُنیا بھی، توحید کی دولت بھی مقدّر بنتی ہے اور رِسالت کی ثروت بھی نصیب ہوتی ہے۔

فصل سوم

معجزہ اور عالمِ اَسباب

لفظِ معجزہ کی ماہیّت، ضرورت و اہمیّت اور حقیقت کا جائزہ لینے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ عالمِ اَسباب کے حوالے سے اِنسانی زِندگی کا کائناتی مطالعہ کرنے والے اَربابِ علم و دانش کے نزدیک ظہورِ معجزہ کی کیا حیثیت ہے اور زِندگی کے اِرتقائی سفر میں معجزہ اِعتقادی حوالوں کو کس طرح قوّتِ اِیمانی سے ہمکنار کرتا ہے! یہ بات ذِہن نشین رہنی چاہیئے کہ معجزہ عالمِ اَسباب کے تابع نہیں ہوتا اور نہ یہ اَسباب و عِلل کے بندھے ٹکے نظام کے تحت واقع ہوتا ہے بلکہ معجزہ کا صدُور اِن اَسباب و عِلل اور معمول کے نِظام کے برعکس ہوتا ہے۔ گویا معجزے کا وُقوع پذیر ہونا اَسباب و عِلل کا مرہونِ منّت ہوتا ہے اور نہ یہ معمول کے نِظام کے مطابق اَنبیائے کرام کے دستِ حق پرست سے ظہور میں آتا ہے۔ اَسباب و عِلل کا نظام کوئی اَٹل اور ناقابلِ منسوخ ضابطہ نہیں ہے۔ یہ تو باری تعالیٰ کی عادتِ جاریہ کا مظہر ہے۔ اِن اَسباب و عِلل کی حقیقت فقط اِتنی ہے کہ یہ اللہ ربّ العزّت کے اِرادے اور مشیّت کے مختلف مظاہر ہیں اور اُس کی قدرتِ کاملہ کے شواہد ہیں۔ خالقِ کائنات نظامِ ہستی کو ایک خاص طریقے سے چلا رہا ہے۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اُس کے حکم کا پابند ہے اور وہ خود کسی حوالے سے بھی کسی اَمر کا پابند نہیں کیونکہ وہ ہر چیز پر قادِر ہے، ہر چیز کا خالق ہے، ہر چیز کا مالک ہے، وہ ربُّ العالمین ہے۔ مولائے روم نے اِس حقیقت کی طرف یوں اِشارہ کیا ہے:

؎ بیشتر اَحوال بَر سُنّت رَوَد
گاہ قُدرت خارقِ سُنّت شَوَد

دُنیا کے زیادہ تر واقعات اُنہی عاداتِ جاریہ کے مطابق ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی قدرتِ الٰہیہ اِس قانون کو توڑ کر اَپنی حاکمیّتِ کاملہ کا اِظہار بھی کرتی ہے۔

اَسباب و عِلل کا سائنسی حوالوں سے مطالعہ کرنے والے اَربابِ دانش و تحقیق جانتے ہیں کہ نظامِ ہستی ایک ضابطے اور اُصول کے تحت چل رہا ہے، لیکن بعض اَوقات قدرت اِن عام ضابطوں اور اُصولوں کے برخلاف اپنی مخلوقات کے لئے زِندگی کے راستوں کو آسان بھی بناتی ہے۔ ایسے میں ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آخر وہ کون ہے جس کے اِشارے پر عناصرِ فطرت اپنے فطری خواص کے برعکس کام کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً: سائنس کا ایک مسلّمہ اُصول ہے کہ حرارت سے چیزیں پھیلتی ہیں اور سردی سے سکڑتی ہیں، لیکن سمندروں کے پانی کا درجۂ حرات جب نقطۂ اِنجماد کی طرف آتا ہے تو برف بن کر سُکڑنے کی بجائے پھیل جاتا ہے۔ اگر پانی عام معمولات کے مطابق یہاں بھی برف بنتے ہوئے سُکڑ جائے تو سطحِ سمندر پر تیرنے والی برف کثیف ہو کر تہہ میں جا بیٹھے اور سُمندری مخلوقات نیچے دب کر آناً فاناً موت کی وادی میں چلی جائیں۔ قادرِ مطلق کو چونکہ اپنی اِن مخلوقات کی حیات مقصود ہے، اِس لئے یہاں فطرت کے عام اُصولوں سے اِختلاف کی راہ نکالی گئی اور پانی کو حکم دیا گیا کہ وہ ٹمپریچر کی کمی کی صورت میں 4° سینٹی گریڈ تک سکڑتا رہے مگر جونہی اُس کے مالیکیولز کا درجۂ حرارت 4° سینٹی گریڈ سے مزید گرتے ہوئے نقطۂ اِنجماد کی طرف بڑھنے لگے، زیادہ یخ مالیکیولز آس پاس کے دِیگر کم سرد مالیکیولز کی نسبت پھیلنا شروع کر دیں، ان کی کثافت (Density) کم ہو جائے اور وہ نسبتاً ہلکے ہو کر سطحِ آب کی طرف تیر آئیں۔ اور اس طرح برف بننے کا عمل سطح سے تہہ کی طرف شروع ہو، تاکہ سمندروں کی مُنجمد سطح کے نیچے آبی مخلوقات اُس خدائے وحدہٗ لاشریک کی حِکمت سے زِندہ و سلامت رہیں۔

اَسباب و عِلل کی گرد میں پھنس جانے اور خارقُ العادت کو قبول نہ کرنے والوں کو یہ بات ذِہن نشین رکھنی چاہیئے کہ اِن اَسباب و عِلل کی ایک عِلۃُ العِلَل اور مُسبّبُ الاَسباب ہستی بھی ہے، جس کے سامنے اِن اَسباب و عِلل کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ جب اُس قادرِ مطلق ہستی کا اِرادہ اور مشیّت ''کُنْ فَیَکُوْنَ'' کے ذریعہ غالب آتا ہے تو پھر اَسباب و عِلل کے متوازی ایک الگ نظام وُجود میں آتا ہے۔ اُسے برہان کا نام دیا جائے یا معجزات کا، لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ اُس خالقِ کائنات کی یہ شانِ تخلیق ہر لحہ فروغ پذیر ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ وہ خدائے جبّار و قہّار کے اِرادہ و مشیّت کے بارے میں کوئی غلط تصوّر بھی اپنے ذِہن میں لا سکے۔

معجزہ......قوانینِ فطرت کے خرق کا نام

درج بالا بحث سے ہم اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ معجزے کا موازنہ اَسباب و عِلَل سے کرنا اور عادتِ جاریہ کی کسوٹی پر اُسے پرکھنا کسی بھی اِعتبار سے قرینِ قیاس نہیں۔ اِسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اَسباب و عِلَل اِس نظامِ کائنات میں جاری و ساری اَعمال اور اُن کے نتائج سے عِبارت ہیں جبکہ معجزہ اِس نظامِ کائنات کا ایک خصوصی عمل ہے جو اللہ کے نبی یا اُس کے رسول کے دستِ حق پرست پر اِذنِ اِلٰہی سے ظہور میں آتا ہے۔

ذِہن میں یہ سوال آ سکتا ہے کہ یہ اَسباب و عِلَل کیا ہیں اور نظامِ حیات میں اُن کا مقام اور اہمیّت کیا ہے؟ یہ دراصل ہمارے مُشاہدات و تجربات ہیں۔ مثلاً ہم ایک چیز کو اپنے کسی خاص عمل سے متعدّد بار گزرتے دیکھتے ہیں اور پھر یقین کر لیتے ہیں کہ تمام چیزیں اَیسے ہی وُقوع پذیر ہوتی ہیں......یعنی ایک ضابطے اور اُصول کے تحت...... چونکہ وہ عمل بار بار ہمارے سامنے آتا ہے، اِس لئے وہ ہمارے شعور میں پُختہ ہوتا جاتا ہے۔ ہمیں ایک قطرۂ آب سے خون، خون سے گوشت اور پھر اُس میں رگیں،

پٹھے، ہڈیاں، دِل و دِماغ، جگر اور گُردوں کے پیدا ہونے، پھر اُس میں رُوح کی آمد، بعد ازاں ایک مدّتِ معیّنہ کے بعد ایک بچے کی صورت میں پیدا ہونے پر کوئی تعجّب نہیں ہوتا، حتیٰ کہ وہ بچہ اپنے بچپن اور لڑکپن کے مراحل سے گزر کر عالمِ شباب میں داخل ہوتا ہے، جوانی کی منزلیں طے کر کے اور بڑھاپے کی دہلیز سے گزر کر لحد کی تاریکیوں میں فنا ہو جاتا ہے لیکن ذہنِ اِنسانی ذرا بھی متعجب نہیں ہوتا، اِس لئے کہ یہ عمل معمول کا عمل ہے۔ ہم بار بار اِس عمل کا مُشاہدہ کرتے ہیں۔ اِسی طرح ایک چھوٹا سا جامد دانہ ایک تناور درخت کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اُس پر پھول آتے ہیں، پھل آتا ہے، شاخوں پر شاداب ساعتیں بسیرا کرتی ہیں پھر وہ درخت سُوکھ جاتا ہے، پتے جھڑ جاتے ہیں اور وہ اِیندھن بن کر رزقِ زمین بن جاتا ہے لیکن ہم اُس پر اِظہارِ تعجب نہیں کرتے، اِس لئے کہ ہم اِس عمل کو متعدّد بار دیکھتے ہیں اور یہ عمل ہمارے شعور کا حصہ بن جاتا ہے۔ اِس کے برعکس اگر ایک بے جان لکڑی سانپ کی شکل اِختیار کر لے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوں، رات کے ایک اِنتہائی قلیل عرصے میں حضور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجدِ حرام سے مسجدِ اَقصیٰ تک اور پھر سِدرۃُ المنتہیٰ اور لامکاں سے ہوکر واپس آ جائیں تو ایسی صورت میں عقلِ اِنسانی کو اِن واقعات کی صداقت پر اِیمان لانے میں تامّل ہوگا اور وہ اِس سوچ میں پڑ جائے گی کہ ایسا کس طرح ممکن ہے! کیونکہ اِس سے پہلے ایسے واقعات مُشاہدے میں کبھی نہیں آئے۔

زِندگی کا یہ ایک عمومی دستور ہے کہ ایک چیز کو ہم بار بار دیکھتے ہیں تو وہ قصرِ اِیقان میں سما جاتی ہے۔ اِدراک وشعور اُس عمل کی تصدیق اور توثیق کرتے ہیں، لیکن جس چیز یا عمل کے بارے میں سنا ہو اور نہ اُسے روزمرّہ زِندگی میں دیکھا ہو تو جب وہ چیز یا عمل ہمارے مُشاہدے میں آتا ہے تو قُدرتی طور پر اُس عمل کو دیکھ کر ہم تصویرِ حیرت

بن جاتے ہیں اور تذبذب کے عالم میں اُس عمل سے اِنکار کر دیتے ہیں حالانکہ قصور ہمارے مُشاہدے اور تجربے کا ہوتا ہے۔ اگر ایک چیز ہمارے مُشاہدے یا تجربے میں نہیں آتی تو اِس سے اُس چیز کا وُقوع یا عدم وُقوع کیسے لازم آ سکتا ہے؟ معجزے کی حقیقت بھی یہی ہے کہ اُس کی توجیہہ وتعلیل عام تجربات کی دسترس اور گرفت سے باہر ہوتی ہے۔ اِنسانی عقل اُس کا اِحاطہ نہیں کر سکتی۔ اِس لمحۂ اِستعجاب کو اِدراک وشعور اپنی گرفت میں لینے میں ناکام رہتے ہیں، اِس لئے کہ معجزہ قوانینِ فطرت کے خرق کا نام ہے۔ یہ اِنسانی زندگی کے روزمرّہ کے مُشاہدات وتجربات کے برعکس ہوتا ہے، ایسا اِس لئے ہے کہ ہمارے تجربات و مشاہدات کی بنیاد قوانینِ فطرت پر ہوتی ہے جبکہ معجزہ قوانینِ فطرت کے تابع نہیں ہوتا بلکہ اُن کے برعکس اور خِلاف ہوتا ہے۔ قوانینِ فطرت کے مطابق ایک آدمی مر جائے تو دوبارہ زِندہ نہیں ہوتا اور اگر دوبارہ زِندہ ہو جائے تو یہ قوانینِ فطرت کے برعکس ہو گا۔ قوانینِ فطرت کے برعکس ہونا ہی معجزہ ہے۔ اس کا وُقوع قلیل اور صدُور اَنبیاء ورُسل سے ہوتا ہے۔ عقلِ اِنسانی جسے تماثیل اور تائیدِ مسلسل کے ذریعہ کسی واقعہ، عمل یا چیز کے وُجود کا یقین آتا ہے، اور مُسلسل ایک جیسے عمل سے ایک جیسا نتیجہ پیدا ہونے کے بعد اُسے قوانینِ فطرت میں داخل کرتی ہے...... معجزے کے معاملہ میں وہ ایسا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ قوانینِ فطرت کے اَٹل اور قطعی ہونے کے نظریئے کو اَب جدید سائنس بھی ردّ کر چکی ہے۔ اِسلئے فکری اور نظری مباحث میں اُلجھے بغیر ہمیں یہ جان لینا چاہئے کہ قوانینِ فطرت کی اَصلیّت قانونِ عادت کی ہے جسے مذہبی نقطۂ نظر سے ہم ''فطرۃ اللہ'' کہتے ہیں۔

معجزہ......قدرتِ اِلٰہیہ

ہر آن پھیلتی اور تغیر پذیر کائنات میں ہر طرف مادّے کی رنگا رنگ صورت

پذیری نظر آتی ہے۔ اِمکانات کی ایک نہیں اَن گنت دنیائیں آباد ہیں۔ نظامِ اَسباب و عِلل پوری کائنات پر محیط ہے۔ کارخانۂ قدرت میں ہر سیارہ، ہر ستارہ اور ہر کہکشاں کائناتی اُصولوں اور ضابطوں کی پابند ہے۔ کبھی کبھی اُس پابندی سے اِنحراف کی راہیں بھی نکلتی ہیں اور کائنات کے خالق کے وُجود کی گواہی دیتی ہیں۔ نظامِ اَسباب وعِلل اور اَنبیاء کے معجزات دونوں دَرحقیقت اللہ ربّ العزّت کی مَشیّت و اِرادے کے مظہر ہیں۔ قرآن نے اِس نظامِ اَسباب وعِلل کو کھول کھول کر بیان کیا ہے اور سائنسی اِنکشافات کی وضاحتاً اور صراحتاً نشاندہی کی ہے۔ مثلاً متعدّد مقامات پر فرمایا کہ آسمان سے برسنے والی بارِش، زمین سے اُگنے والی فصلوں، شاخوں پر آنے والے پھولوں اور پھلوں کے پیدا ہونے کا سبب بنتی ہے۔ اِرشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقاً لَّكُمْ۔ (البقرہ، ۲:۲۲)

اور آسمانوں کی طرف سے پانی برسایا پھر اُس کے ذرِیعے تمہارے کھانے کے لئے (اَنواع و اَقسام) کے پھل پیدا کئے۔

آج کا اِنسان خلا کی وُسعتوں میں زِندگی کے اِمکانات کا متلاشی ہے۔ اِس سلسلے میں وہ سب سے پہلے کسی سیارے پر پانی کے وُجود کی تلاش میں ہے کیونکہ جہاں پانی ہوگا وہاں ہوا بھی ہوگی اور وہاں زِندگی کے کسی نہ کسی شکل میں موجود ہونے کے اِمکانات بڑھ جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ۔ (النور، ۲۴:۴۵)

اور اللہ نے ہر چلنے پھرنے والے (جاندار) کی پیدائش (کی کیمیائی اِبتداء) پانی سے فرمائی۔

پانی کے بغیر زِندگی کا کوئی تصوّر ممکن نہیں، پانی زندگی کی علامت ہے۔ اِرشادِ خداوندی ہے:

وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ۔ اور ہم نے (زمین پر) ہر زِندہ چیز (کی زِندگی) کی نمود پانی سے کی۔ (الانبیاء،۲۱:۳۰)

یہ کرۂ ارضی ایک بہت بڑی خِلعتِ سبز میں لپٹا ہوا ہے۔ ہر قدم شاداب ساعتوں نے پڑاؤ ڈال رکھے ہیں۔ ہر طرف سبزے کی چادر بچھی ہوئی ہے، لہلہاتی فصلیں کھڑی ہیں، وسیع و عریض علاقوں پر جنگلات پھیلے ہوئے ہیں یعنی اِس دُنیا میں نباتات کی الگ دُنیا قائم ہے۔ نباتی زِندگی کا آغاز بھی پانی ہی سے ہوا۔ اِرشاد فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِيْ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ۔ اور وُہی ہے جس نے آسمان کی طرف سے پانی اُتارا۔ پھر ہم نے اُس (بارِش) سے ہر قسم کی رُوئیدگی نکالی۔ (الانعام،۶:۹۹)

قرآن میں صراحت کے ساتھ عناصرِ فطرت اور کارکنانِ قضاوقدر کی برہمی کا ذِکر کیا گیا ہے اور اَجزاء کے پریشان ہونے کو موت کی علامت قرار دِیا گیا ہے کہ بادِصرصر اور آندھیاں اپنے ساتھ تباہی، بربادی اور ہلاکت کو لے کر چلتی ہیں۔ یہ سب نظامِ ہستی ایک عالمِ اَسباب کے تحت لگا بندھا ہے:

فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ أَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ پھر ہم نے اُن پر زور کی آندھی (اُن کے) نحوست کے دِنوں میں بھیجی (یعنی وہ دِن اُن کے حق میں منحوس

(حم السجدہ، ۴۱:۱۶) ثابت ہوئے) تاکہ ہم اُنہیں دُنیا میں رُسوائی کے عذاب کا مزہ چکھائیں۔

سورۂ احقاف میں فرمایا:

رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ أَلِيْمٌO تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا۔

(الاحقاف، ۴۶:۲۴، ۲۵)

(یہ وہ) آندھی ہے جس میں دردناک عذاب ہے o (یہ آئے گی اور) ہر شئے کو اپنے ربّ کے حکم سے اُکھاڑ پھینکے گی۔

سورۃ الذّاریات میں فرمایا:

إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَO مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِO

(الذّاریات، ۵۱:۴۱، ۴۲)

جب ہم نے اُن پر خیر سے خالی آندھی چلائی o (وہ) جس چیز پر گزرتی اُسے ریزہ ریزہ کئے بغیر نہ چھوڑتی o

اِس وسیع و عریض کائنات میں آگ بھی ایک بہت بڑی قوّت ہے۔ آگ کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ہر چیز کو جلا دیتی ہے۔ منہ زور آندھیوں اور بپھری ہوئی سمندری موجوں کی طرح آگ اور حرارت جہاں زِندگی کی علامت ہے وہاں بہت بڑی تباہی کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوتی ہے:

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ۔

(المومنون، ۲۳:۱۰۴)

اُن کے چہروں کو آگ جھلس دے گی۔

آگ عموماً لکڑی سے پیدا ہوتی ہے اور لکڑی درختوں کی صورت میں زمین کی عطا ہے:

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَاراً۔	وُہی ہے جس نے تمہارے لئے سبز درخت سے آگ پیدا کی۔
(یٰسین، ۳٦:۸۰)	

اِس نظامِ اَسباب وعِلل کے تحت قرآن نے مختلف اَشیاء کے طبعی خواص کا بھی ذِکر کیا ہے اور اُن خواص سے پیدا ہونے والے مفید نتائج کو بیان فرمایا ہے۔ مثلاً شہد میں صحت بخشنے اور بیماری دُور کرنے کی خاصیت ہے:

یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِلنَّاسِ۔	اُن کے شِکموں سے ایک پینے کی چیز نکلتی ہے، (وہ شہد ہے) جس کے رنگ جداگانہ ہوتے ہیں۔ اُس میں لوگوں کے لئے شِفاء ہے۔
(النحل، ١٦:٦٩)	

پانی کی بھی خاصیّت بیان فرمائی کہ وہ پیاس بجھانے اور درخت اُگانے کے خواص رکھتا ہے:

هُوَ الَّذِیْ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَ مِنْهُ شَجَرٌ۔	وُہی ہے جس نے تمہارے لئے آسمان کی جانب سے پانی اُتارا، اُس میں سے (کچھ) پینے کا ہے اور اُسی میں سے (کچھ) شجرکاری کا ہے۔
(النحل، ١٦:١٠)	

اِسی طرح قرآن نے فرمایا کہ اُون میں گرمی کی خاصیت پائی جاتی ہے:

فِيْهَا دِفْءٌ۔	اُن میں تمہارے لئے گرم لباس ہے۔
(النحل، ١٦:٥)	

ہماری یہ دُنیائے رنگ و بو اَسباب وعِلل کے وسیع حصارِ دِلنواز میں آباد ہے۔ مادّہ اپنی تمام تر رَعنائیوں کے ساتھ ہرطرف جلوہ گر ہے اور اپنے خالق کی حمد میں

مصروف ہے۔ مذکورہ بالا آیاتِ کریمہ اِسی نظامِ اَسباب وعِلل پر صریح دلیل ہیں اور اللہ ربّ العزّت کی ربوبیت اور اُلوہیت کا اِعلان کر رہی ہیں۔ یہاں ایک بات قابلِ توجہ ہے، مذکورہ بالا آیاتِ ربانی کے سیاق وسباق اور اُن کے نفسِ مضمون سے یہ چیز بخوبی آشکار ہو رہی ہے کہ اُن سب میں فعل کی نسبت خالقِ اَرض وسماوات نے خود اپنی طرف کی ہے کہ اِس نظامِ اَسباب وعِلل اور مختلف اَشیاء کے خواص کا ظہور ہماری مشیّت و اِرادہ اور حکم واَمر سے ہو رہا ہے۔ یہ اِس لئے کہ کہیں اِنسان ظاہری عِلل و اَسباب دیکھ کر اور اَشیاء کے خواص کا مُشاہدہ کر کے علّتِ حقیقی کا اِنکار نہ کر دے اور اُن کو مُستقل بالذّات تسلیم کر کے کہیں شرک میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اور یوں ہر چیز کھول کھول کر بیان کر دی گئی، تعلیماتِ قرآنیہ کا یہی اِمتیاز ہے کہ یہ تشکیک و اِبہام سے پاک ہوتی ہے۔

اَنبیائے کرام اور اَولیائے عِظام بھی بسا اَوقات عادتِ جاریہ اور ظاہری اَسباب وعِلل کے خِلاف اُمور کے وُقوع پر اِستعجاب کا اَظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر باری تعالیٰ اُن کے اِستعجاب کو اپنی قدرتِ مطلقہ اور مشیت سے دُور کر دیتا ہے۔

حضرت سارہ علیہا السلام کو جب بڑھاپے میں حضرت اِسحاق علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دی گئی تو وہ حیران رہ گئیں۔ اُنہوں نے اِس پر تعجب اور حیرت کا اِظہار کرتے ہوئے فرمایا:

يٰوَيْلَتىٰٓ ءَأَلِدُ وَ أَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ؕ إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ O (هود، ١١:٧٢)	وائے حیرانی! کیا میں بچہ جنوں گی، حالانکہ میں بوڑھی (ہو چکی ہوں) اور میرے شوہر (بھی) بوڑھے ہیں۔ بیشک یہ تو بڑی عجیب چیز ہے O

بشارت دینے والے ملائکہ نے جواب میں کہا:

أَتَعْجَبِيْنَ مِنْ أَمْرِ اللهِ۔ — کیا تم اللہ کے حکم پر تعجب کر رہی ہو۔

(ھود، ۱۱:۷۳)

اللہ تو قادرِ مطلق ہے۔ وہ جس اَمر کا اِرادہ کرتا ہے...... ہو جاتا ہے۔ پھر اُس کی قدرتِ کاملہ پر تعجب کیسا! ہاں عالمِ اَسباب وعِلل میں عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ بڑھاپے میں میاں بیوی دونوں جسمانی اِعتبار سے کمزور ہو جاتے ہیں اور اَولاد کی اُمید ناپید ہو جاتی ہے، مگر اللہ ربّ العزّت کی قدرتِ مطلقہ سے کچھ بھی بعید نہیں۔ کارکنانِ قضاوقدر اُس کے حکم کے منتظر رہتے ہیں۔ فرشتوں کے جواب سے حضرت سارہ علیہا السلام مطمئن ہو گئیں کہ یہ سب کچھ خالقِ روز وشب کے اَمر سے ہوگا۔

اِسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام بھی حضرت یحیٰ علیہ السلام کی ولادت سے قبل ضعیف ہو چکے تھے۔ اُن کی زوجۂ مطہرہ بانجھ پن کا شکار تھیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو اِس صورتحال سے بخوبی آگاہی تھی کہ اُن کی زوجۂ مطہرہ اَولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ ظاہری عدم اِستعداد اور اَسباب وعِلل کے موجود نہ ہونے کے باوجود وہ قدرتِ اِلٰہی اور مشیتِ اَیزدی پر کامل یقین رکھتے ہوئے بارگاہِ خداوندی میں اپنے وارِث کے لئے عرض پرداز ہوتے ہیں۔ جب حضرت زکریا علیہ السلام کو اِجابتِ دُعا کی بشارت دی جاتی ہے تو وہ بتقاضائے بشریت ظاہری اَسباب وعِلل کے فقدان کو دیکھتے ہوئے تعجب کا اِظہار فرماتے ہیں۔ اَیسا ہونا اُنہیں عجیب سا لگتا ہے:

رَبِّ أَنّٰی يَكُوْنُ لِيْ غُلَامٌ وَّ كَانَتِ امْرَأَتِيْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ — اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوسکتا ہے درآنحالیکہ میری بیوی

الْكِبَرِ عِتِيًّاO (مریم،۸:۱۹)

بانجھ ہے اور میں خود بڑھاپے کے باعث (اِنتہائی ضعف میں) سُوکھ جانے کی حالت کوپہنچ گیا ہوں o

بارگاہِ خداوندی سے حضرت زکریا علیہ السلام کے اِس اِستعجاب اور حیرانی پر جواب آتا ہے:

قَالَ كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْئًا۔ (مریم،۹:۱۹)

فرمایا: ''(تعجب نہ کرو) ایسے ہی ہوگا تمہارے ربّ نے فرمایا ہے کہ یہ (لڑکا پیدا کرنا) مجھ پر آسان ہے اور بیشک میں اِس سے پہلے تمہیں بھی پیدا کر چکا ہوں، اُس حالت سے کہ تم (سرے سے) کوئی چیز ہی نہ تھے۔

بندے کی کیا مجال کہ اپنے ربّ کی قدرتِ مطلقہ کے بارے میں کوئی غلط تصوّر بھی ذِہن میں لائے یا غبارِ اِبہام میں تشکیک کی تصویریں سجائے۔ شکوک وشبہات کی گرد لوحِ دِل پر نقشِ اِیمان واِیقان کی ہر تصویر کو مٹا دیتی ہے۔ آیتِ مذکورہ میں عدم سے وُجود میں آنے کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ اِستعجاب کیسا؟ حیرت کیسی؟ اے پیغمبر! ہم نے تمہیں بھی تو پیدا کیا ہے۔ مذکورہ بالا آیتِ کریمہ کے یہ کلمات ''قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ'' (تمہارے ربّ نے فرمایا کہ یہ مجھ پر آسان ہے) اِنتہائی قابلِ توجہ ہیں۔ اِن اَلفاظ سے جہاں اللہ ربّ العزّت کی قدرتِ کاملہ کا اِظہار ہوتا ہے وہاں اَسباب وعِلل کے نظام کے برعکس اُس کی مشیت کے تحت ہر چیز کی تخلیق ہوتی دِکھائی گئی ہے اور اِس طرح کہ ظاہراً کوئی علت ہے اور نہ کوئی سبب۔ پھر بھی اُس چیز کو وُجود عطا کیا جاتا ہے جو باری تعالیٰ کی قدرت علی الاطلاق پر ایک دلیلِ ناطق

ہے۔ قصرِ اِیمان واِیقان سے اِنحراف کا کوئی راستہ نہیں نکلتا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وِلادت باسعادت بھی ایک معجزہ ہے۔ بن باپ کے بچے کی پیدائش اللہ ربّ العزّت کی قدرتِ کاملہ کی مظہر ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ کو جب آپ کی پیدائش کی خوشخبری سنائی گئی تو اِنسانی فطرت کے عین مطابق اُنہوں نے اُس پر اِستعجاب کا اِظہار کیا کہ ظاہری اَسباب وعِلل کے بغیر اَیسا ہونا باعثِ تعجب اور معمول کے خِلاف ہے۔ قدرتی طور پر حضرت مریم علیہا السلام یہ اِطلاع پا کر تصویرِ حیرت بن گئیں لیکن حیرت کے اِس اِظہار میں قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ کے اِنکار کا شائبہ تک موجود نہیں:

قَالَتْ أَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلَامٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّ لَمْ أَكُ بَغِيًّاO (مریم، ۱۹:۲۰)

(مریم نے) کہا: ’’میرے ہاں لڑکا کیسے ہوسکتا ہے، جبکہ مجھے کسی اِنسان نے چُھوا تک نہیں اور نہ ہی میں بدکار ہوں‘‘O

حضرت مریم علیہا السلام کے اِستعجاب پر خوشخبری لے کر آنے والے فرشتے نے اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا:

قَالَ كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَ لِنَجْعَلَهٗ آيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا وَ كَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّاO (مریم، ۱۹:۲۱)

(جبرئیل نے) کہا: ’’(تعجب نہ کر) ایسے ہی ہو گا (کیونکہ) تیرے ربّ نے فرمایا ہے: یہ (کام) مجھ پر آسان ہے اور (یہ اِس لئے ہو گا) تاکہ ہم اِسے لوگوں کے لئے نشانی اور اپنی

جانب سے رحمت بنا دیں اور یہ اَمر
(پہلے سے) طے شدہ ہے'' o

گویا اُس عظیم معجزے کے ظہور سے بھی مقصود بندگانِ اِستعجاب و حیرت پر خالقِ کائنات کی قدرتِ کاملہ کو اِس طرح آشکار کرنا ہے کہ ذِہنِ اِنسانی پر جمی تشکیک کی دُھول دُھل جائے اور اِیمان واِیقان کا چہرہ نکھر آئے۔ بندہ اِیمانِ کامل کی دَولت سے سرفراز ہو اور اللہ کی یہ نشانیاں دیکھ کر اُس کے اِعتقادات میں مزید پختگی پیدا ہو اور وہ دِل و جان سے تسلیم کر لے کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ خدائے ذوالجلال کے حکم کا پابند ہے اور عناصرِ فطرت اُسی کی مشیّت کے تابع ہیں۔

معجزہ کا صدُور اِذنِ اِلٰہی سے ہوتا ہے

جب معجزہ قدرتِ اِلٰہیہ کا آئینہ دار ہے اور یقیناً ہے تو معجزہ کا صدُور بھی اِذنِ اِلٰہی سے ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ اللہ کا نبی یا اُس کا رسول جب چاہے اور جیسے چاہے اُس کے ہاتھ پر معجزات کا صدُور ہوتا جائے کیونکہ معجزہ کا سبب اور علّت براہِ راست باری تعالیٰ کی مشیّت اور اِرادہ سے ہے۔ یہ اِرادہ اور مشیّت کبھی عادتِ جاریہ اور اَسباب و عِلل کے پردہ میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی مشیّتِ اِلٰہی اَسباب وعِلل کی بجائے کھلی نشانی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

پہلی صورت کی مِثال طوفانِ نوح ہے، قومِ ہود کے لئے آتش فشاں پھٹ پڑا اور تباہ کن زلزلے نے اُنہیں گھیر لیا، حضرت ایوب علیہ السلام چشمے کے پانی سے صحت یاب ہو گئے، قومِ صالح کے لئے آندھی آئی، مکہ میں خوفناک قحط پڑا، غزوۂ خندق کے موقع پر زبردست آندھی چلی۔ یہ تمام واقعات ظاہری اَسباب وعِلل کے خِلاف نہیں بلکہ اِرادہ ومشیتِ اِلٰہی سے اِن چیزوں کا ظہور ہوا تا کہ اللہ کے بندے علاماتِ حق سے آشنا

ہوں اور اُن کے اِیمان میں پختگی آئے۔

دُوسری صورت کی مثال مُردوں کا جی اُٹھنا، چاند کا دوٹکڑے ہو جانا، عصا کا سانپ بن جانا اور اَنگشتِ پیمبر سے پانی کے چشمے کا جاری ہو جانا ہے۔ اِن خلافِ معمول واقعات کی توجیہہ اَسباب وعِلل سے ممکن نہیں اور نہ عادتِ جاریہ کے مطابق اِن کی تفہیم ہوسکتی ہے۔ اِس لئے کہ اُن کی علّتِ غائی اللہ ربّ العزّت کی مشیّت اور اِرادہ کے سِوا کوئی اور چیز نہیں۔ تاریخِ اَنبیاء کے اَوراق اُلٹیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اَنبیاء علیہم السلام نے بھی اپنے معجزات کے حوالے سے یہی بتایا کہ اُن کے ہاتھ سے جو خلافِ معمول واقعات کا صدُور ہو رہا ہے وہ صرف اور صرف بارِی تعالیٰ کی قدرت، مشیّت اور اِذن سے ہی ہوتا ہے۔ معجزے کی حقیقی علّت اور سبب بھی یہی ہے اور یہی حقیقتِ معجزہ ہے۔ چنانچہ معجزے کے ظہور سے اِنکار اللہ ربّ العزّت کی قدرتِ مطلقہ کا اِنکار ٹھہرے گا اور اِیمان کا نور شِرک کے اندھیروں اور مُنحرف چہروں کے جنگل میں کھو جائے گا۔

اِس ساری بحث سے ہم اِس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اِس کائناتِ رنگ و بو میں اَسباب وعِلل کا نظام اللہ ربّ العزّت کی عادتِ جاریہ کے تابع ہے مگر وہ کبھی کبھی کسی حکمت ومشیّت کے تحت اپنی عادتِ جاریہ کے برعکس بھی کسی چیز کا ظہور فرماتا ہے۔ اُسی ظہور کا نام معجزہ ہے۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ معجزہ اللہ کے نبی اور رسول کے اُس فعل کو کہتے ہیں جس کی توجیہہ اَسباب وعِلل سے ممکن نہ ہو اور عقلِ اِنسانی اُس حقیقت کا کامل اِدراک کرنے سے قاصر رہے۔

فصل چہارم

معجزہ......لازمۂ نبوّت

معجزات کے ظہور سے اَنبیاء کی حاکمیّت وتصرّفات کو اُجاگر کرنا اور شکوک وشبہات کی گرد میں اَٹے ہوئے اَذہان کو نورِ اِیمان سے منوّر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ معجزات اللہ ربّ العزّت کی قدرتِ کاملہ کا پرتو ہوتے ہیں۔ ہدایتِ آسمانی کی روشنی میں اللہ اپنے بندوں کو صراطِ مُستقیم دِکھاتا ہے اور ہر حوالے سے اپنے بندوں کی دِلجوئی ودستگیری اور رَہنمائی فرماتا ہے۔ اگرچہ نبی کو ہدایتِ آسمانی کی حقّانیت ثابت کرنے کے لئے محیرالعقول واقعات کی حاجت نہیں ہوتی تاہم اہلِ اِیمان کے اِیمان کی پختگی کے لئے نبی اور رسول کے ہاتھ پر معجزات کا صدُور ہوتا ہے، تاکہ قصرِ اِیمان اور غبارِ تشکیک میں اِیمان اور تیقّن کے چراغ رَوشن ہوں اِس لئے کہ مقصدیت ہر حوالے سے تخلیقِ کائنات کا اَساسی رویہ قرار پاتی ہے۔ معجزات کے صدُور سے اَنبیاء کی تصدیق کے ساتھ ساتھ اِنسانی اَذہان میں اِس عقیدے کو پختہ کرنا ہوتا ہے کہ اِس کائناتِ رنگ و بو کا خالق ہر چیز پر قادِر ہے اور چونکہ معجزات عطائے ربی ہوتے ہیں اِس لئے اُن کا اِنکار خدائے دوجہاں کی قدرتِ کاملہ کا اِنکار ہے۔ قرآنِ حکیم اور اَحادیثِ نبوی ﷺ کے مطالعہ سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے۔ باری تعالیٰ نے اِنسانوں کی رُشد و ہدایت کے لئے جتنے بھی اَنبیاء علیھم السلام کو مبعوث فرمایا اُنہیں اپنے دعویٔ نبوّت کی صداقت و حقّانیت کے لئے ظاہری و باطنی معجزات سے بھی نوازا۔ ظاہری معجزات وہ ہیں جو خرقِ عادت کی صورت میں گاہے گاہے رُونما ہوتے ہیں جبکہ باطنی معجزات وہ ہیں جو اللہ کے نبی کے اَخلاقِ حمیدہ اور اَوصافِ جلیلہ کے ساتھ اِرشاداتِ جمیلہ پر مُشتمل ہوتے ہیں۔ نبی کا کردار اور اُس کی شخصیت ہی معجزاتی جمال کا مظہر

ہوتی ہے۔ قرآن حضور رحمتِ عالم ﷺ کی سیرت و کردار کو تمام اِنسانیت کے لئے بالعموم اور اہلِ اِیمان کے لئے بالخصوص اُسوۂ حسنہ سے تعبیر کرتا ہے اور رہتی دُنیا تک اِس مینارۂ نور سے اِکتسابِ شعور کی تلقین کرتا ہے۔ اِرشادِ باری تعالٰی ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔

بے شک تمہارے لئے رسول اللہ (کی زِندگی) میں بہترین نمونہ ہے۔

(الاحزاب، ۳۳:۲۱)

کردار کی روشنی کے ساتھ تمام اَنبیاء کو ظاہری معجزات کی خِلعتِ فاخرہ سے بھی نوازا گیا اور معجزہ لازمۂ نبوّت قرار پایا۔ قرآنی حوالوں سے چند ایک جلیل القدر اَنبیاء و رُسل کے معجزات کا ذِکر کیا جا رہا ہے:

۱۔ حضرت نوح علیہ السلام

وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا وَ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا أَنَّهُمْ مُغْرَقُوْنَO

(ھود، ۱۱:۳۷)

اور تم ہمارے حکم کے مطابق ہمارے سامنے ایک کشتی بناؤ اور ظالموں کے بارے میں مجھ سے (کوئی) بات نہ کرنا وہ ضرور غرق کئے جائیں گے o

۲۔ حضرت ھود علیہ السلام

وَ أَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ O سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمَانِيَةَ أَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍO

اور رہی (قومِ) عاد تو وہ ایک نہایت تندو تیز (اور) سخت ہوا سے تباہ کر دیئے گئے o جس کو اللہ نے سات رات اور آٹھ دِن تک متواتر مسلّط رکھا پھر (اے مخاطب! اگر) تو اُن لوگوں کو

(الحاقہ، ۶۹:۶، ۷)

اُس (آندھی) میں دیکھتا تو اُن کو اَیسا گرا ہوا پاتا جیسے کھجور کے (بے حس و حرکت) کھوکھلے تنے (پڑے ہوتے ہیں)O

۳- حضرت صالح علیہ السلام

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌO

(الاعراف، ۷:۷۳)

یہ اللہ کی اُونٹنی تمہارے لئے نشانی ہے، سو تم اِسے (آزاد) چھوڑے رکھنا کہ اللہ کی زمین میں چرتی رہے اور اِسے برائی (کے اِرادے) سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ تمہیں دردناک عذاب آ پکڑیگاO

۴- حضرت ابراھیم علیہ السلام

قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌO

(البقرہ، ۲:۲۶۰)

اِرشاد فرمایا سو تم چار پرندے پکڑ لو پھر اُنہیں اپنی طرف مانوس کرلو پھر (اُنہیں ذِبح کر کے) اُن کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پر رکھ دو، پھر اُنہیں بلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آ جائیں گے اور جان لو کہ یقیناً اللہ بڑا غالب، بڑی حکمت والا ہےO

۵- حضرت یوسف علیہ السلام

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا قَالَ اَلَمْ اَقُلْ

پھر جب خوشخبری سنانے والا آ پہنچا، اُس نے وہ قمیض یعقوب علیہ السلام کے

لَكُمْ إِنِّيْ أَعْلَمُ مِنَ اللهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَO

(یوسف،۱۲: ۹۶)

چہرے پر ڈال دی تو اُسی وقت اُن کی بینائی لوٹ آئی۔ یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: ''کیا میں تم سے نہیں کہتا تھا کہ بیشک میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''o

۶- حضرت موسیٰ علیہ السلام

فَأَلْقٰى عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ O وَ نَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنَّاظِرِيْنَO

(الاعراف،۷: ۱۰۷، ۱۰۸)

پس موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا (نیچے) ڈال دیا تو اُسی وقت صریحاً اژدہا بن گیاo اور اپنا ہاتھ (گریبان میں ڈال کر) نکالا تو وہ (بھی) اُسی وقت دیکھنے والوں کے لئے (چمکدار) سفید ہو گیاo

۷- حضرت داؤد علیہ السلام

وَ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَ الطَّيْرَ وَ كُنَّا فٰعِلِيْنَO

(الأنبیاء،۲۱: ۷۹)

اور ہم نے پہاڑوں اور پرندوں (تک) کو داؤد علیہ السلام کے (حکم کے) ساتھ پابند کر دیا تھا۔ وہ (سب اُن کے ساتھ مل کر) تسبیح پڑھتے تھے اور ہم ہی (یہ سب کچھ) کرنے والے تھےo

۸- حضرت سلیمان علیہ السلام

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِأَمْرِهٖ

پھر ہم نے (اُن کی اُس دعا کو قبول فرمایا

رُخَآءً حَيْثُ أَصَابَ O

(ص، ۳۸:۳۶)

اور) ہوا کو اُن کا تابع (فرمان) کر دیا کہ وہ اُن کے حکم سے جہاں وہ جانا چاہتے نرم اَنداز سے چلتی O

۹- حضرت زکریا علیہ السلام

قَالَ رَبِّ أَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلَامٌ وَّ كَانَتِ امْرَأَتِيْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا O قَالَ كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ۔

(مریم، ۱۹:۸،۹)

(زکریا علیہ السلام نے) عرض کیا: ''اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے، درآنحالیکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں خود بڑھاپے کے باعث (اِنتہائی ضعف میں) سُوکھ جانے کی حالت کو پہنچ گیا ہوں'' O فرمایا: ''(تعجب نہ کرو) ایسے ہی ہو گا، تمہارے ربّ نے فرمایا ہے: یہ (لڑکا پیدا کرنا) مجھ پر آسان ہے''۔

۱۰- حضرت عیسٰی علیہ السلام

أَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَـةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ أَنِّيْ أَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا م بِإِذْنِ اللهِ۔

(آل عمران، ۳:۴۹)

بیشک میں تمہارے پاس تمہارے ربّ کی جانب سے ایک نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے کی شکل جیسا (ایک پتلا) بناتا ہوں...... پھر میں اُس میں پھونک مارتا ہوں...... سو وہ اللہ کے حکم سے فوراً اُڑنے والا پرندہ ہو جاتا ہے۔

۱۱- **حضرت محمد رسول اللہ ﷺ**

سُبْحَانَ الَّذِیْ أَسْرٰی بِعَبْدِهِ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلٰی الْمَسْجِدِ الْأَقْصٰی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَهُ لِنُرِیَهُ مِنْ آیَاتِنَا إِنَّهُ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُO

(الاسراء، ۱:۱۷)

وہ ذات (ہر نقص اور کمزوری سے) پاک ہے جو رات کے تھوڑے سے حصہ میں اپنے (محبوب اور مقرّب) بندے کو مسجدِ حرام سے (اُس) مسجدِ اَقصیٰ تک لے گئی جس کے گرد و نواح کو ہم نے بابرکت بنا دیا ہے، تاکہ ہم اُس (بندۂ کامل) کو اپنی نشانیاں دِکھائیں۔ بیشک وُہی خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہےO

خالقِ کون و مکاں نے اپنی آخری اِلہامی کتاب میں اُن معجزات کا ذِکر کیا ہے جن کا اُس کے اَنبیاء و رُسل کے ہاتھ پر ظہور ہوا۔ ان کے علاوہ بھی بعض ایسے انبیاء علیہم السلام کا ذِکر موجود ہے جن کے معجزات کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔ مثلاً حضرت اِسحاق علیہ السلام، حضرت اِسماعیل علیہ السلام، حضرت ذوالکفل علیہ السلام اور حضرت اِلیاس علیہ السلام۔ اِن اَنبیاء کا تذکرہ قرآنِ حکیم میں موجود ہے لیکن ان کے معجزات کا بیان درج نہیں۔ قرآن کی اِس خاموشی سے ہرگز ہرگز یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اِن اَنبیاء علیہم السلام کو اللہ ربّ العزّت نے معجزات سے سرفراز نہیں کیا اور اُنہیں کسی بُرہان سے نہیں نوازا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی متفق علیہ حدیثِ مُبارکہ ہے کہ تاجدارِ کائنات حضور رحمتِ عالم ﷺ نے اِرشاد فرمایا:

ما من الأنبياء نبی إلّا أعطی من الآيات ما مثله أومن۔ أو أمن'

جملہ اَنبیائے کرام میں سے ہر نبی کو اُس (کے زمانے) کی مثل معجزات عطا کئے

علیه البشر۔ گئے جس کے سبب اُس پر اِیمان لایا گیا یا لوگ اُس پر اِیمان لے آئے۔

۱۔ صحیح البخاری، ۲: ۱۰۸۰، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، رقم: ۶۸۴۶
۲۔ صحیح المسلم، ۱: ۸۶، کتاب الایمان، رقم: ۲۳۹
۳۔ مسند احمد بن حنبل، ۲: ۳۴۱

اللہ ربّ العزّت نے اپنے اَنبیاء و رُسل میں سے ہر کسی کو معجزات کی خِلعتِ فاخرہ سے نوازا، باطنی معجزات کو اُن کے کردار اور شخصیت کا حصہ بنایا اور ظاہری معجزات کا صدُور اُن کے ہاتھ پر کیا۔ ہر نبی اور رسول کو اپنی دَعوت کے حوالے سے جس سطح کے معاندین اور مُنکرین کا سامنا تھا اُسی اِعتبار سے اہمیت کے حامل معجزات کا صدُور ہوا۔ زمانے اور علاقے کی آبادی کے اِعتقادی حوالوں اور ذِہنی اِستعداد کے مطابق معمولی اور غیر معمولی معجزات کا ظہور ہوتا رہا اور عقلِ اِنسانی اُنہیں اپنے اِحاطے میں لینے سے عاجز آتی رہی۔

باب دوم

اِثباتِ مُعجزہ
اور
جدید سائنسی تحقیقات

فصل اول:

اِثباتِ مُعجزہ اور عقلِ ناقص کا کردار

اِبتدائے آفرینش سے آج تک تاریخِ اِرتقائے اِنسانی اِس اَمر پر شاہدِ عادل ہے کہ اِس کرۂ اَرضی پر بسنے والی اَولادِ آدم نے مادّی اور رُوحانی دونوں دنیاؤں میں تحقیق و جستجو اور علم و عمل کے چراغوں کی روشنی میں حرفِ حق کی تلاش کا سفر ہمیشہ جاری رکھا ہے۔ ہر عہد کی اپنی ایک سچائی ہوتی ہے۔ ذہنِ اِنسانی ہر واقعہ اور ہر نظریہ کو اُس سچائی کی کسوٹی پر پرکھتا ہے اور قلب و نظر میں تیقّن کے چراغ جلا کر اِطمینان، سکون، اَمن، آسودگی اور عافیّت کے جواہر سے اپنے دامنِ آرزو کو سجاتا ہے۔ فاران کی چوٹیوں پر جب **ہر عہد کی دانش کا آفتابِ لازوال** طلوع ہوا تو دُنیا جہالت اور گمراہی کے اندھیروں کی دبیز تہہ میں لپٹی ہوئی تھی، شعور و آگہی کی ہر کرن غبارِ تشکیک کے تارِیک سمندر کا رِزق بن چکی تھی۔ اگر کہیں تفکر کے چراغ روشن بھی تھے تو وہ بھی فلسفیانہ مُوشگافیوں اور عقلِ عیار کی مَن مانی تاوِیلات کی گرد میں کچھ اِس طرح سے اَٹے ہوئے تھے کہ زِندگی کے آئینہ خانے کا ہر عکس اپنی شناخت سے محروم ہو چکا تھا اور ہر طرف مقصدیت سے محروم بے چہرہ لوگ ہجوم در ہجوم جنگل کی خوفناک تارِیکی میں بھٹک رہے تھے۔

ظہورِ اِسلام کے وقت دُنیا سائنسی علوم سے یکسر نابلد تھی۔ یونانی فلسفہ ہی عقل کا معیار متصوّر ہوتا تھا۔ تفسیرِ حیاتِ اِنسانی فلسفے کی لوح پر رَقم تھی اور جملہ حقائق و واقعات کو فلسفے کے حوالے سے دیکھنے کا رواج تھا۔ چنانچہ اَوائل دَورِ اِسلام میں یونانی فلسفے سے متاثر سیرت نگار حضور ختمی مرتبت ﷺ کے مُعجزات کو فلسفے کی روشنی میں حق

ثابت کرتے نظر آتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دَورِ اِسلام کی اِبتدائی صدیوں میں مُعجزاتِ حضور ﷺ کے موضوع پر جتنا بھی علمی کام ہوا اُس کے پس منظر میں یہی فلسفیانہ توجیہات کارفرما تھیں۔

آج کا دَور سائنس کا دَور ہے، جس میں سائنٹیفک اپروچ (Scientific Approach) ہر تحقیق کا بنیادی وصف قرار پائی ہے۔ آج کا کم پڑھا لکھا سادہ اِنسان جو سائنسی علوم سے براہِ راست اِس قدر شغف نہیں رکھتا، وہ بھی کم از کم سائنسی طریقِ کار سے آگاہ ضرور ہے۔ اُس کے اِطمینانِ قلب کے لئے بھی سائنس کو کسوٹی بنا کر حقائق کو پرکھنے کا عمل جاری رکھنا ضروری ہے۔ جدید ذہن محض سنی سنائی بات پر یقین نہیں رکھتا۔ ہمارے عہد کے بچے بھی جگنو کی روشنی کو دِن کے اُجالوں میں پرکھنے کی ضد کرتے ہیں۔ شعور و اِدراک کی یہ منزل صحت مند سوچ کے اَیوان کا بنیادی پتھر ہے۔

ہر دَور کے بنیادی تقاضے مختلف ہوتے ہیں

عہدِ جدید کا ایک عام آدمی بھی جانتا ہے کہ سائنسی بنیادوں پر کام کرنے سے نتائج کس طرح درُست برآمد ہوتے ہیں۔ چنانچہ عصرِ حاضر کے اِنسان سے مخاطب ہونے اور اُسے اِسلامی عقائد و تعلیمات سے رُوشناس کرانے کے لئے کہ وہ ان عقائد و تعلیمات کو اپنے روز و شب کا عنوان بنالے، **''جدید علمِ کلام''** کی ضرورت ہے۔ موجودہ دَور **''صغریٰ''** اور **''کبریٰ''** کے مابین واقع **''حدِ اَوسط''** کو گرا کر **''نتیجے''** تک پہنچنے کا دَور نہیں بلکہ اِس دَور میں **تجربہ**، **مُشاہدہ**، **مفروضہ** اور پھر بارہا تجربات سے حاصل شدہ **تنظیمِ نتائج** کے ذریعے **''نظریئے''** تک پہنچنے کا اُسلوب، حقیقی عقلی اُسلوب کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہر عہد کے بنیادی تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔

سیدنا علیؓ کا فرمان ہے: ''اپنے بچوں کو وہ تعلیم نہ دو جو تمہارے والدین نے تمہیں دی تھی، کیونکہ اُن کا زمانہ تمہارے زمانے سے مختلف ہے''۔ یہ اِنتہائی ترقی پسندانہ رویّہ اِجتماعی سطح پر وُہی قومیں اپنا سکتی ہیں جو ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے ہنر سے بہرہ ور ہوں اور جو آسمان کے کناروں سے نکل کر تسخیرِ کائنات کے سفر کو اپنا شِعار بنائیں۔

قرونِ وُسطیٰ میں یونانی فلسفے کی اِسلامی عقائد پر یلغار کے جواب میں اُس دَور کے علمائے کرام اور ائمہ عظام نے علمِ کلام کو فروغ دیا اور اس کے ذرِیعے ثابت کیا کہ اِسلام ہی وہ سچا دِین ہے جو ہر شعبۂ زِندگی میں اِنقلاب آفریں تبدیلیوں کا متمنّی ہے۔ آج کے زوال پذیر دَور میں اگر ہم عظمتِ رفتہ کی بازیابی کے آرزومند ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم قوموں کی اِمامت کا فریضہ سر انجام دیں اور ہر دستارِ فضیلت ہمارے برہنہ سروں کا مقدّر بنے تو ہمیں تبلیغِ دین اور فروغِ اِسلام کا سارا کام اَز سرِ نو سائنسی بنیادوں پر مرتّب کرتے ہوئے ذہنِ جدید کو یہ باور کرانا ہوگا کہ بطور نظامِ حیات اِسلام کے نفاذ کے جتنے اِمکانات آج روشن ہیں شاید ماضی قریب میں اِس سے پہلے کبھی نہ تھے۔ ہمیں سائنسی بنیادوں پر اِسلام کی حقانیت کا پرچم بلند کرنا ہوگا۔ مُستشرقین کے بے تکے اِلزامات کا منہ بند کرنے کے لئے ...... فقط جذباتی سطح پر نہیں ...... عقلی اور فکری سطح پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنا پس منظر اور پیش منظر روشنیوں سے تحریر کرنے کے لئے '**جدید علمِ کلام**' کو اَپنانا ہوگا تاکہ ہم سائنسی اَندازِ فکر رکھنے والے آج کے جدید معاشروں کے ناآسودہ ذِہنوں کو آسودہ لمحوں کی بشارت دینے کا کارنامہ سرانجام دیتے ہوئے اُنہیں نظری اور فکری حوالوں سے یہ باور کرا سکیں کہ اِسلام ہی ہر دَور کے اِنسان کا فطری عقیدہ ہے، اور سکون سے محروم اِنسان کو اگر اَمن، عافیت اور آسودگی کی تلاش ہے تو اُسے دہلیزِ مصطفیٰ ﷺ پر جھک جانا ہوگا کہ اِس دہلیز سے پھوٹنے والی روشنی کی ہر کرن مُعجزاتی تاثیر لئے ہوئے ہے جو اِنسان کے حال و قال دونوں کو لذّتِ آشنائی سے

ہمکنار کرنے کی صلاحیّت رکھتی ہے۔

مُعجزہ ایک اَزلی صداقت کا نام ہے

یہاں اِس اَمر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ فلسفہ و سائنس مُعجزے کی حقیقت کو حیطۂ شعور میں لانے میں ممدّ و معاوِن تو ثابت ہو سکتے ہیں اور اِیمان کی پختگی کا باعث بھی بن سکتے ہیں لیکن انہیں مُعجزات کی تفہیم کی اَساس یا کلید قرار نہیں دیا جا سکتا، اِس لئے کہ مُعجزات جو ربِ کائنات کی قدرتِ مطلقہ کا مظہر ہوتے ہیں کسی فلسفیانہ اور سائنسی توجیہہ کے محتاج نہیں ہوتے۔ مُعجزہ ایک اَزلی صداقت کا نام ہے۔ یہ بات بھی ذِہن نشین رہنی چاہئے کہ مُعجزہ وہ حقیقت ہے جو عقلِ اِنسانی کی تمام تر پرواز سے بالاتر ہے۔ مُعجزہ خلافِ معمول اور خارِقِ عادت اَفعال میں سے ہے۔ اِس لئے کہ یہاں عقل مجبورِ محض ہو کر رہ جاتی ہے۔ تاجدارِ کائنات حضور رحمتِ عالم ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات تو سراپا مُعجزہ ہے۔ وہ اِس لئے بھی کہ قرآن اگر مُعجزہ ہے......اور یقیناً ہے......تو صاحبِ قرآن کی حیاتِ مقدسہ کا اُسلوب بھی تمام مُعجزاتی کمالات کی تفسیر و تعبیر ہے۔ جس طرح آقائے نامدار ﷺ تمام نبیوں اور رسولوں کے جِلَو میں ممیّز و ممتاز حیثیت کے مالک ہیں اور منصبِ اُولٰی پر جلوہ اَفروز ہیں، بالکل اِسی طرح آپ ﷺ کا مُعجزاتی نظم بھی اَنبیائے ماسبق کے مُعجزات پر حاوِی ہے اور اَنبیاء کے گروہِ پاکباز اں کا کوئی فرد بھی نبوت کے خصائص و کمالات میں اور عظمتِ مُعجزات میں دُرِیتیم، آمنہ کے لال ﷺ کا ہمسر نہیں۔

اِنسانی عقل کا عجز

عقل کو کسی مسئلہ کی تفہیم کے لئے ایک خاص طریقِ کار میں سے گزرنا ہوتا ہے

اور ایک خاص اُسلوب اپنانا ہوتا ہے۔ مثلاً جب تک کوئی چیز آنکھوں سے دکھائی نہ دے عقل اُس کے عدم اور وُجود میں اِمتیاز نہیں کرسکتی، زبان جب تک کسی چیز کو چکھ نہ لے عقل اُس کے ذائقے کی نوعیت کو پہچاننے سے معذور ہوتی ہے، ہاتھ جب تک کسی چیز کو چھو نہ لیں عقل اُس کی سختی یا نرمی کا تعین کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ اِنسان کو اپنی عقل پر بڑا ناز ہے، بھولا بھٹکا اِنسان یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ جو چیز عقل کے حیطۂ اِدراک میں نہ آسکے وہ حقیقت ہی نہیں۔ ذہنِ اِنسانی آج بھی غبارِ تشکیک کی تاریکیوں میں گم ہے۔

یہ دَورِ تشکیک نیا نہیں بلکہ آج سے تین ہزار سال پہلے بھی اس کرۂ ارضی پر ایسے ہی ایک دَور کا غلبہ ہوا تھا، جو تاریخ کا متمدّن دَور کہلاتا ہے۔ مادّی حوالے سے اِنسان ترقی کی کئی منازِل طے کر چکا تھا۔ جمہوری شعور اِنسانی سوچوں کا مرکز و محور بنا ہوا تھا۔ یونان کی فضائیں علم و ہنر کی روشنی سے معمور تھیں لیکن فکری اور روحانی طور پر بانجھ ساعتوں کا قافلہ بھی زمین پر اُتر آیا تھا۔ فلاسفۂ یونان نے اپنی سوچ اور فہم و اِدراک کی تاریخ کا آغاز بھی اِسی نکتے سے کیا تھا کہ جس بات کا اِدراک عقل کرے وہ حقیقت، باقی سب فسانہ۔ فلسفہ کی تاریخ میں اُس دَور کو '**دَورِ اوّلیت**' کہا جاتا ہے۔

یونانی فلاسفرز کے نزدیک کسی بھی چیز کی حقیقت کو جاننے کا ذریعہ محض عقل ہی ہے لیکن اُس کے ساتھ وہ اِس حقیقت سے بھی اِنکار نہ کر سکے کہ ہزاروں حقیقتیں ایسی بھی ہیں کہ جن کو عقلِ اِنسانی بھی سمجھنے سے قاصر ہے۔ اِس لئے کہ عقلِ اِنسانی کا اِنحصار حواسِ خمسہ پر ہے۔ گویا عقل کی بنیاد پر اُٹھائے گئے اَفکار و نظریات کی خود ہی نفی کر دی گئی کہ کچھ چیزیں ورائے عقل بھی ہوتی ہیں۔ بہرحال یہ دَور بنیادی طور پر '**حسّیت کا دَور**' تھا کیونکہ علم کا ماخذ و منبع حواسِ خمسہ کو قرار دیا گیا تھا اور اِس بناء پر اُنہیں اپنے نقطۂ نظر کے کھوکھلے پن کا اِحساس ہوگیا۔ طویل مدت کے بعد ہی سہی...... بہرحال اِس نقطۂ

نظر سے اِنحراف کی راہ اپنانے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ پھر اُس کے بعد **'دَورِ تشکیک'** کا آغاز ہوا۔

فلسفہ کی تاریخ کا بیان ہمارا مقصود نہیں بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ جس طرح آج کا اِنسان عقل کو فیصلہ کن سمجھتا ہے، آج سے تین ہزار سال پہلے کا اِنسان بھی عقل ہی کو فیصلہ کن گردانتا تھا۔ چنانچہ تاریخ کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ آج کے اِنسان کا نقطۂ نظر بھی حتمی نہیں کہ عقل جس حقیقت کا اِنکار کر دے وہ حقیقت ہی نہیں۔ انبیائے کرام علیہم السلام کے مُعجزات کو عقل کے پیمانے اور شعور کی کسوٹی پر پرکھنا اور کہتے پھرنا کہ چاند کسی ہستی کی اُنگلی کے اِشارے پر کیسے دولخت ہوسکتا ہے! کسی کی مرضی پر سورج کیسے اُلٹی گردش پھر سکتا ہے! اور یہ کیسے ممکن ہے کہ کنکریوں میں جان پڑ جائے اور وہ بلند آواز سے کلمہ پڑھنا شروع کر دیں! کہاں کی دانائی ہے۔

جدید سائنس کے اِعترافات

اِس کائناتِ رنگ و بو میں ورائے عقل بھی بہت سے حقائق ہیں۔ عقل کو خود اپنے اس عجز کا احساس ہے کہ کائنات کی ہر حقیقت اُس کے حیطۂ اِدراک میں نہیں آ سکتی۔ سائنس اُن حقائق کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے لیکن کاملاً اُنہیں سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ **اِنسانی عقل حواسِ خمسہ کے ساتھ پرواز کرتی ہے۔ جہاں حواسِ خمسہ ساتھ چھوڑ دیں وہاں عقل کی پرواز موقوف ہو کر رہ جاتی ہے۔ حواس کے خام مواد کے بغیر عقل عضوِ معطل ہے۔** ایک پیدائشی بہرہ آواز کی حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا، اِسی طرح پیدائشی نابینا رنگ اور روشنی کی آمیزش سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اَب یہ عقل کے لئے تدبر و تفکر کا مقام ہے کہ جس طرح چار حواس کی موجودگی میں پانچویں حِس سے متعلقہ محسوسات سے آگاہی ممکن نہیں بالکل اِسی

طرح اِس کائناتِ ہست و بود میں ہزار ہا ایسی اَشیاء اور ایسے حقائق موجود ہیں جو ہمارے پانچوں حواس کے دائرۂ محسوسات سے ماوراء ہیں۔ **کیا یہ ضروری ہے کہ تمام کائنات کی خِلقت اُسی بنیادی ڈھانچے کی مطابقت میں عمل میں لائی گئی ہو جس بنیادی ڈھانچے کے مطابق اِنسانی حواس کی تخلیق ہوئی ہے؟** کائنات کے تمام موجودات کو حواسِ خمسہ کی کسوٹی پر پرکھنا اَیسے ہی خلافِ عقل بات ہے جیسے کوئی نابینا اُسے چار حواس کے بل بوتے پر پرکھتا پھرے، وہ یقیناً صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ پوری کائنات تو دُور کی بات ہے، اِس کرۂ ارضی پر بھی کئی جاندار ایسے ہیں جن کی تخلیق اُس بنیادی ڈھانچے سے بہت مختلف طریق پر ہوئی ہے اور وہ ایسی بے شمار محسوسات سے یکسر نابلد ہیں جو حضرتِ اِنسان کے دائرۂ اِختیار میں شامل ہیں۔ اِس ضمن میں چھپکلی اور سانپ کی بعض اَقسام خاص طور پر قابلِ ذِکر ہیں جو محض دو اَبعاد سے شناسا ہیں اور تیسرے بُعد (Dimention) کا وُجود اُن کے حواس کے مطابق ناپید ہے۔ اِس کے علاوہ بہت سے جانوروں کا مخصوص رنگوں کے لئے 'کلر بلائینڈ' ہونا بھی اِسی ضمن میں آتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بے شمار اَحوال، واقعات اور حقائق اِنسان کے حواسِ خمسہ کی گرفت سے بھی کلیتًا آزاد ہیں۔

جدید سائنسی علوم تو قدیم فلسفے کی طرح اِس بات سے بھی اِنکاری نہیں کہ حقیقت وہ ہے جس کی حواسِ خمسہ سے تصدیق و توثیق ممکن ہو۔ جدید سائنس خود ایسی سینکڑوں مخلوقات اور اَحوال و واقعات کی دریافت کا کارنامہ سراِنجام دے چکی ہے جنہیں صرف حواسِ خمسہ اور محض عقلِ اِنسانی کے بل بوتے پر جاننا ممکن نہ تھا۔ مثلاً 'خوردبین' (Microscope)، 'دُوربین' (Telescope) اور 'پست موجی سراغ رساں' (Microwave Detector) جیسے آلات نے اِنسانی فہم و اِدراک کو اِس قابل کر دیا ہے کہ وہ اَن دیکھی مخلوقات کو دیکھ سکے اور لاکھوں نوری سال

کی مُسافت پر پیدا ہونے والے 'سیاہ شگافوں' (Black Holes) سے نکلنے والی 'ایکس ریز' کی بدولت اُن کا مُشاہدہ کر سکے۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قدیم فلسفے کی نسبت جدید سائنس کو مُعجزات اور دیگر ماوراء العقل عقائد پر قائل کرنا نسبتاً آسان ہے۔ جس طرح آج سے چندصدیاں پیشتر آج کے سائنسی حقائق سے کوئی واقف نہ تھا بالکل اِسی طرح آج کی جدید سائنس بھی اگلی صدیوں میں پیش آمدہ حقائق کا اِدراک کرنے سے قاصر ہے۔ جدید سائنس نے دینِ اِسلام ...... جو درحقیقت دینِ فطرت ہے...... کی بیان کردہ بہت سی حقیقتوں کو مِن وعَن تسلیم کرلیا ہے۔ باقی چند ایک مقامات پر اگر اشکال ہے تو عین ممکن ہے کہ اِکیسویں صدی میں جو یقیناً اِسلام کی صدی ہے، اِسلام کے تمام عقائد و اَعمال کے مبنی بر فطرت اور مبنی بر حقیقت ہونے کی شہادت بھی اُس وقت کی جدید ترین سائنس دینے کا اِعزاز حاصل کرے۔ مغربی مفکرین اور مستشرقین نے اِسلام اور پیغمبرِ اِسلام ﷺ کے بارے میں فکری مغالطّوں اور علمی بد دیانتیوں کے جو طُومار باندھے تھے، اب اُنہیں جدید سائنسی اِنکشافات کی روشنی میں اپنی مفروضوں پر مبنی آراء سے رُجوع کر لینا چاہیئے کیونکہ جن حقائق کو اُن نام نہاد مفکرین نے تضحیک کا نشانہ بنا کر اِسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی تھی اُنہیں جدید سائنس تسلیم کرتی جا رہی ہے۔ اُنہیں اپنی تحقیق اور اپنے گھر کی گواہی کو تسلیم کر لینا چاہیئے اور ضد اور تعصّب کی دلدل سے نکل کر اَعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرنا چاہیئے کہ یہی اَہلِ علم کا شیوہ ہے۔ یہ معاملہ تو تھا اِسلام کے عقائد و اَعمال کے فطری ہونے کا، اَب جہاں تک معاملہ ہے مُعجزات کا، تو مُعجزہ وہ حقیقت ہے جو کسی بھی دَور میں کاملاً فہمِ اِنسانی میں سمانے سے قاصر ہے۔ جدید سائنس کی روشنی میں مُعجزے کو جزواً سمجھنا اور اُس کی جزوی توجیہہ کرنا کسی حد تک ممکن ہے مگر کاملاً مُعجزے کا اِدراک تا قیامِ قیامت ممکن نہیں کیونکہ مُعجزہ اُن حقائق پر مشتمل ہوتا ہے جو حواسِ خمسہ اور عقلِ اِنسانی تو کجا اِنسان کے اِیجاد کردہ تمام تر سائنسی آلات کی حدود

سے بھی ماوراء ہوتا ہے۔

سیاہ شگاف (Black Hole) کی کامل تفہیم کے بعد اگلی نسلوں کو اس کی بدولت وقت میں سفر کی ترغیب دینے والا آج کا اِنسان اپنی حیرت انگیز اِیجادات کی بدولت اِس کرۂ ارضی سے کروڑوں اور اربوں میل کی مسافت پر وُقوع پذیر ہونے والے کائناتی تغیرات کا نہ صرف مُشاہدہ کر رہا ہے بلکہ اُن مُشاہدات کی روشنی میں اَہلِ زمین کی سلامتی اور بقاء کے منصوبے بھی بنا رہا ہے اور اَولادِ آدم کے لئے آسودہ لمحوں کی تلاش میں اپنے نظامِ شمسی سے بھی بہت دُور خلا کی بے اَنت وُسعتوں میں اِنسانی بستیاں آباد کرنے کا آرزومند ہے۔ کائنات کی تسخیر کے اِس سفر میں اُسے جن تجربات و مُشاہدات سے گزرنا پڑا، وہ اُسے تخلیقِ آدم اور تخلیقِ کائنات کی اُن ابدی سچائیوں کے بہت قریب لے آئے ہیں جن کا ذِکر آخری اِلہامی صحیفے ......قرآنِ مجید...... میں ربِ کائنات نے کھول کھول کر بیان کیا ہے اور جنوں اور اِنسان کو آسمانوں کی حدود سے نکل کر مُشاہدۂ حق کی ترغیب دی ہے۔ جوں جوں اِنسان جدید سائنسی علوم میں مہارت حاصل کر رہا ہے توں توں قرآنِ حکیم میں درج سائنسی حقائق کی تصدیق و توثیق ہوتی جا رہی ہے اور آج کا سائنسدان اِس نتیجے پر پہنچ چکا ہے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے حضور رحمتِ عالم ﷺ نے جو سائنسی اِنکشافات کئے تھے وہ اِلہام کے بغیر ممکن ہی نہیں، اِس لئے قرآن آسمانی ہدایت کی سچی کتاب اور پیغمبرِ اِسلام ﷺ اِس کائنات کے خالق و مالک کے سچے رسول ہیں۔

عادتِ اِلٰہیہ اور قدرتِ خداوندی کی تفہیم

جدید ترین کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور اِنٹرنیٹ سے لے کر مصنوعی سیاروں اور خلائی سٹیشنوں کے وسیع و عریض نظام تک، اِنسانی زِندگی میں تحقیق و جستجو کے اَن گنت چراغ

روشن ہیں۔ اِنسان اِس تگ و دَو میں ہے کہ کائنات کے راز ہائے سربستہ سے پردہ اُٹھا کر اُس کی تخلیق، مقصدِ تخلیق اور کائنات کے اِنجام سے آگاہی حاصل کرے اور پھر اِنسان کی تخلیق، اِس کائنات میں اُس کے کردار اور دِیگر حقائق کی تہہ تک پہنچ سکے۔ یہ سب کچھ ایک مربوط نظام کے تحت تکمیل پذیر ہے۔ اسے سادہ اور آسان اَلفاظ میں **'فطری نظام'** کہتے ہیں جبکہ اِصطلاحاً اسے **'تکوینی نظام'** اور **'مکافاتِ عمل'** کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اِس کائناتِ رنگ و بو میں صرف دو چیزوں کا ظہور ہوتا ہے:

۱-اللہ ربّ العزّت کی عادت

۲-اللہ ربّ العزّت کی قدرت

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ خالقِ کائنات کی عادت بھی اُس کی قدرتِ کاملہ ہی کے تحت ہوتی ہے، تاہم اِصطلاحاً **اللہ کی عادت** سے مُراد اللہ تعالیٰ کا تخلیق کردہ نظامِ فطرت یا تکوینی نظام ہے، جس کے تحت یہ کائناتِ پست و بالا مسلسل حرکت پذیر ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ کائنات کا آغاز تکوینی نظام کے تحت ہوا اور بالآخر اِس کا اِنجام بھی اِس تکوینی نظام کے تحت ہوگا۔

'اللہ کی قدرت' سے مُراد تمام وہ اَفعال ہیں جو عام نظامِ فطرت سے ہٹ کر وُقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اللہ ربّ العزّت کی عادت کا اِدراک و شعور اور اُس کے آغاز سے اِنجام تک تمام پہلوؤں کا اِحاطہ، عقلِ اِنسانی کی جہدِ مسلسل اور کوششِ بسیار کا ماحصل ہے۔ اِس کے برعکس **اللہ کی قدرت** کا اِدراک ذہنِ اِنسانی کے بس کی بات ہی نہیں۔ مثلاً اگر نر اور مادہ کے اِمتزاج سے بچہ پیدا ہو تو بات اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اِنسانی عقل میں سما جائے گی کہ یہ تیسرا فرد کیسے تخلیق ہوا، اور اگر اَسباب و عِلل کے بغیر **قدرتِ اِلٰہیہ** کا ظہور ہو تو عقل اُس کا اِدراک حاصل کرنے سے قاصر رہے گی۔ مثلاً

ربِ ذوالجلال محض خاک سے ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام کی تخلیق فرما دے تو یہ اللہ ربّ العزّت کی قدرت کا ظہور ہے، جس کا اِدراک عقل سے ممکن نہیں۔ حضرت صالح علیہ السلام کے ڈنڈے سے پہاڑ کا پھٹنا اور اُونٹنی کا برآمد ہونا، حضرت مریم علیہا السلام کے پاس بند کمرے میں بے موسمی پھل آنا...... یہ سب **قدرتِ الٰہیہ** کے نظارے ہیں۔ عقل اِن نظاروں کے اِدراک کی طاقت نہیں رکھتی۔ عقل کی پہنچ **عادت** کے مطابق ہوتی ہے اور جو چیز ماہیت کے لحاظ سے تو وُقوع پذیر ہو مگر **عادت** کے خلاف ہو، وہ عقل کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ عقل ایک مقررہ اُصول، سبب اور نتیجے کے تحت **عادت** کے نظام کو سمجھتی ہے اور جب **عادت** کا نظام ہی بدل جائے اور خدا کو اپنی **قدرت** کا اِظہار مقصود ہو تو عقل اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوُجود معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ اِس لئے اَنبیائے کرام کے مُعجزات کو اپنی عقل کے پیمانے سے ماپنے والوں کو اِس بنیادی نکتہ سے متفق ہونا پڑے گا کہ **مُعجزہ کہتے ہی اُس اَمر کو ہیں جو عقل کی جملہ صلاحیتوں کو عاجز کر دے۔** اگر وہ واقعتاً عقل کے دائرے میں آ جائے تو وہ مُعجزہ نہیں ہے اور اگر مُعجزہ، مُعجزہ نہ رہے تو نبی کے کمالات کا اِنکار ہو جاتا ہے اور یہ صورتحال **قدرتِ الٰہیہ** کو کسی صورت میں قبول نہیں۔

تمدّنی اور ثقافتی پس منظر میں مُعجزات کا ظہور

تاریخِ اَنبیاء و مُرسلین ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر نبی اور ہر رسول کو کوئی نہ کوئی ایسا مُعجزہ ضرور عطا فرماتا ہے جو اپنے عہد کے معروضی حالات اور تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ تاریخ کے مختلف اَدوار میں عقلِ اِنسانی کسی نہ کسی فن کو اپنے عروج پر لے جا چکی ہوتی ہے، لہٰذا اُس نبی کے عہد کے لوگوں کے ذِہنی اور فکری اِرتقاء کو مدِنظر

رکھتے ہوئے اُسے ایسا مُعجزہ عطا کیا جاتا ہے کہ اُس کے پورے دَور میں عقلِ اِنسانی کسی ایسی چیز کو اِیجاد نہ کر سکے جو اُس نبی یا رسول کے مُعجزہ کو (نعوذُ باللہ) مات کر دے یا اُس مُعجزے کی نفی کر دے۔ مُعجزے کے لئے ضروری ہے کہ وہ عقلِ اِنسانی کی ماحصل تمام تر اِیجادات سے آگے نکل جائے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دَورِ نبوت میں یونانی اَطبّاء حضرات عجیب عجیب بیماریوں کو دوَا دے کر دُور کر دیتے تھے۔ یہ کارنامہ عقلِ اِنسانی کا تھا۔ اِس فکری اور نظری پس منظر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ مُعجزہ عطا ہوا کہ آپ مُردوں کو زِندہ کر دیتے، مادرزاد اندھوں کو قوّتِ بینائی عطا کر دیتے، کوڑیوں کو اِذنِ شفا سے ہمکنار کرتے۔ آپ کا پورا عہد اپنی تمام تر تہذیبی، تمدّنی اور ثقافتی ترقی کے باوجود اللہ کے نبی کے ایک بھی مُعجزے کا جواب پیش نہ کر سکا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہدِ مبارکہ میں عقلِ اِنسانی نے جادُو جیسے فن کو اِیجاد کیا۔ قرآنِ حکیم میں فرعون کے دربار کا ذِکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ فرعون نے اللہ کے نبی کے مقابلے میں بڑے بڑے جادُوگروں کو اِکٹھا کیا اور اُنہیں اپنے کمالات دِکھانے کے لئے کہا۔ جادُوگر زمین پر اپنی رسیاں پھینکتے تو وہ رسیاں سانپ بن جاتیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اُن جادُوگروں کے مقابلے میں اپنا عصا پھینکنے کا حکم ہوا اور یوں **'قدرتِ الٰہیہ'** کے مظہر کے طور پر آپ کا عصا ایک اژدھا بن کر سارے سانپوں کو نگل گیا۔

مُعجزاتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمہ گیریت

سابقہ تمام اَنبیائے کرام علیہم السلام کی نبوّتیں چونکہ زمان و مکان کی پابند تھیں اِس لئے اُنہیں اُسی سطح کے محدُود مُعجزات عطا کئے گئے۔ جب نبیِٔ آخر الزّماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور ہوا تو گو پوری دُنیا جہالت کی تاریکیوں میں لپٹی ہوئی تھی، تاہم تمدّنی اور ثقافتی

حوالوں سے آپ کا عہد ماضی سے یکسر مختلف تھا۔ یہ تاریخِ اِرتقائے نسلِ اِنسانی کا ایک ایسا دَور تھا جس میں عقلِ اِنسانی ترقی کی کئی منازل طے کرچکی تھی اور اُسے قیامت تک تعمیر و ترقی کے اَن گِنت مراحل سے گزرنا تھا اور کائنات کی وُسعتوں میں بستیاں آباد کرنا تھیں۔ اِس لئے حضور ﷺ کو جو مُعجزات عطا کئے گئے وہ بھی جدید سائنسی علوم کے ذریعہ خلاؤں میں اِنسان کی پیش رفت کو مدِنظر رکھ کر عطا کئے گئے۔ اِس لئے اَب قیامت تک عقلِ اِنسانی سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں جتنی بھی ترقی کرتی چلی جائے مُعجزۂ مصطفوی ﷺ کی وُسعتوں اور عظمتوں کا جزوی طور پر بھی جواب پیش کرنے سے معذور رہے گی۔

دَورِ نبوتِ مصطفوی میں عقلِ اِنسانی کا سب سے بڑا کارنامہ جو بیسویں صدی کے آخر تک منصۂ شہود پر چھایا رہا، وہ خلا کی تسخیر ہے۔ آج کا اِنسان زمین کی پستیوں سے اُٹھ کر خلا کی بلندیوں کو پھلانگتا ہوا چاند کو مسخر کر چکا ہے اور اِکیسویں صدی میں مریخ اور دیگر سیارگانِ فلکی کی تسخیر کے لئے بھی کوشاں ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی بدولت ہونے والی نت نئی اِیجادات کے بعد عقلِ اِنسانی کے پاس مُعجزۂ معراجِ مصطفوی کو جھٹلانے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔ **اگر آج ناقص العقل اِنسان کا مادّی اَسباب کی بناء پر خلاؤں کا سینہ چیرتے ہوئے چاند پر قدم جمانا اور اپنے نظامِ شمسی کی آخری بلندیوں کو چھونا ممکن ہے، تو مسببُ الاسباب کی عطا کردہ رُوحانی قوّت کے ذرِیعہ سرورِ کائنات ﷺ کا آسمانوں کی وُسعتوں کو چیرتے ہوئے سِدرۃُ المُنتھیٰ اور قَابَ قَوسَین تک جا پہنچنا کیونکر ممکن نہیں!** عقلِ اِنسانی اِیجادات کے جو اَنبار لگا رہی ہے، وہ مُعجزاتِ حضور ﷺ کی صحت کی دلیل کا کوئی نہ کوئی راستہ ہے۔ مُعجزے کا پورا اِدراک عقلِ اِنسانی سے ممکن نہیں لیکن جب عقل اپنے

کمال ......یعنی اِقرارِ نقص...... کی طرف بڑھی تو مُعجزے کی صحت کے قریب ہوتی چلی گئی۔ عقل جب تک عقلِ ناقص ہو...... نبی ﷺ کی عظمتوں کا اِعتراف کرنے سے قاصر رہتی ہے، لیکن جب اپنے نقص کا اِقرار و اِعتراف کر کے عقلِ کامل بن جاتی ہے تو عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کا کوئی نہ کوئی گوشہ اُس پر بھی آشکار ہو جاتا ہے۔ علامہ اِقبالؒ نے اسی عقلِ ناقص کے بارے میں فرمایا تھا:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

جدید سائنسی علوم کی تمام تر سعی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی عادت کا راز تلاش کرنے میں پنہاں ہے۔ **عادتِ الٰہیہ** کے راز کی جستجو ہی سائنس کا مکمل دائرۂ عمل ہے۔ مُعجزہ **اللہ کی قدرت** کا اِظہار ہونے کے ناطے جدید سائنسی تحقیقات کی ساری جد و جہد اور ہر طرح کی کاوِش کے باوُجود اُس کے دائرۂ کار سے خارِج ہے۔ مُعجزے کی سطح کا آغاز ہی **عادتِ الٰہیہ** کی آخری سرحدوں سے ہوتا ہے اور سائنس تو ابھی **عادتِ الٰہیہ** کی اَبجد بھی نہیں سیکھ پائی، البتہ قاعدۂ مطابقت اور مماثلت کے تحت اللہ ربّ العزّت کی عادت کے بیان میں بعض اَوقات سائنس لاشعوری طور پر مُعجزے کی مؤیّد اور مُصدِّق ضرور بنتی چلی جاتی ہے۔ اِس حوالے سے تفصیلی بحث آگے آئے گی۔

فصل دوم

جدید سائنس
اور
معجزہ معراج

جیسا کہ ہم پہلے ذِکر کر چکے ہیں کہ جدید سائنسی علوم جن کائناتی سچائیوں پر سے پردہ اُٹھا رہے ہیں اور قدم قدم پر اِنکشافات کی نئی نئی دُنیاؤں کے ظہور کی تصدیق کر رہے ہیں، اِس سے اِسلام اور پیغمبرِ اِسلام ﷺ کی آفاقی تعلیمات کی سائنسی توجیہہ خود بخود ہوتی جا رہی ہے اور آج کا سائنسدان اپنی سائنسی تحقیقات کے حوالے سے قرآن کو اِلہامی کتاب اور حضور رحمتِ عالم ﷺ کو خدا کے فرستادہ پیغمبرِ آخر ﷺ تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ اپنے تمام تر تعصّبات کے باوجود اُنہیں اِعترافِ حقیقت کرتے ہی بنی ہے کہ اِس کے سِوا اُن کے پاس کوئی چارہ نہیں۔ عہدِ رسالت مآب ﷺ میں شاید اِس کی ضرورت بھی نہ تھی مگر آج چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد معجزاتِ نبوی پر سائنسی حوالوں سے غور و فکر کیا جا رہا ہے۔ صحابہ کرامؓ مثالی اِیمان کے مالک تھے۔ خلافِ عادت واقعات دیکھ کر نہ وہ کسی فکری تذبذب کا شکار ہوتے، یقین کی راہوں پر اُن کے قصرِ اِیمان کی دیواروں میں شگاف پڑتے اور نہ وہ مشروط کمٹمنٹ کے لئے حیلے بہانے تراشتے۔ اُن کے پائے اِستقلال میں لغزش کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، اِس لئے کہ اُن کے سینے یقینِ محکم کی دولت سے معمور تھے۔ شکوک وشبہات کی گرد اُن کے آئینۂ دل پر ذرا سی بھی خراش نہ ڈال سکتی تھی۔

عہدِ جدید کا مسلمان غبارِ تشکیک میں گم ہے اور اُسے معجزاتِ نبوی اور کمالاتِ مصطفوی ﷺ سے بخوبی آگاہ کرنے کے لئے اُس کے ساتھ جدید سائنسی تناظر میں بات کرنا ضروری ہے۔ اگر مسلمان دانشور اِس سلسلے میں محنت کریں تو نہ صرف یہ کہ

نوجوان نسل کا اِیمان غارت ہونے سے بچایا جا سکتا ہے بلکہ غیر مسلموں کو بھی عظمتِ مصطفیٰ ﷺ سے رُوشناس کراتے ہوئے دَعوت و تبلیغِ دین کا فریضہ بطریقِ اَحسن ادا کیا جا سکتا ہے۔ ذیل میں ہم سرورِ اَنبیاء ﷺ کے بعض معجزاتِ جلیلہ کا جدید سائنسی حوالوں سے بالاختصار ذِکر کریں گے تاکہ عقل کے غلام اور مادّی سوچ رکھنے والے محققین بھی ربوبیت باری تعالیٰ کو دِل و جان سے تسلیم کر کے بارگاہِ خداوندی میں سربسجود ہونے کا اِعزاز حاصل کریں گے۔ اِس جگہ تفصیل میں جائے بغیر چند چیدہ چیدہ معجزات کا ذِکر صرف اِجمالاً ہی کیا جائے گا، تفصیلی مطالعہ کے لئے کتاب کے آخری حصے میں موجود واقعاتِ معجزات پر مبنی حصہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

عالمِ بشریت کی زد میں

معراج کمالِ معجزاتِ مصطفیٰ ﷺ ہے۔ یہ وہ عظیم خارقِ عادت واقعہ ہے جس نے تسخیرِ کائنات کے مقفّل دروازوں کو کھولنے کی اِبتداء کی۔ اِنسان نے آگے چل کر تحقیق و جستجو کے بند کواڑوں پر دستک دی اور خلاء میں پیچیدہ راستوں کی تلاش کا فریضہ سراَنجام دیا۔ رات کے مختصر سے وقفے میں جب اللہ ربّ العزّت حضور رحمتِ عالم ﷺ کو مسجدِ حرام سے نہ صرف مسجدِ اَقصیٰ تک بلکہ جملہ سماوِی کائنات (Cosmos) کی بے اَنت وُسعتوں کے اُس پار ’’قَابَ قَوْسَيْنِ‘‘ اور ’’أَوْ أَدْنٰى‘‘ کے مقاماتِ بلند تک لے گیا اور آپ مدّتوں وہاں قیام کے بعد اُسی قلیل مدّتی زمینی ساعت میں اِس زمین پر دوبارہ جلوہ اَفروز بھی ہو گئے۔

آج سے چودہ سو سال قبل علومِ اِنسانی میں اِتنی وُسعت تھی اور نہ اِتنی گیرائی اور گہرائی کہ معجزاتِ رسول ﷺ کا کوئی اَدنیٰ جزو ہی اُن کے فہم و اِدراک میں آ جاتا حتی کہ اُس وقت بہت سے علومِ جدیدہ کی مُبادیات تک کا بھی دُور دُور تک کہیں نام و نشان

نہ تھا۔ آج عقلِ اِنسانی اپنے اِرتقاء، اپنی تحقیق اور جستجو کے بل بوتے پر جن کائناتی صداقتوں اور سچائیوں کو تسلیم کر رہی ہے، ہزاروں سال قبل اِن کی تصدیق و توثیق وحیِ اِلٰہی کے بغیر ممکن نہ تھی۔ تاریخ شاہد عادل ہے کہ جمیع مسلمانانِ عالم اِیمان بالغیب اور **قدرتِ اِلٰہیہ** کے ظہور پر اِیمان رکھنے کی وجہ سے بغیر دلیل معجزاتِ مصطفیٰ ﷺ کے ہمیشہ قائل رہے۔ عہدِ حضور ﷺ، عہدِ صحابہ اور بعد میں آنے والے اُن مسلمانوں کا اِیمان قابلِ رشک اور قابلِ داد تھا کہ ظہورِ قدرتِ اِلٰہیہ کے ناقابلِ فہم و اِدراک ہونے کے باوجود اُن کا اِیمان کبھی متزلزل نہیں ہوا، اُن کے آئینۂ دل پر کبھی بھی شبہات کی گرد اور وسوسوں کی دُھول نہیں پڑی، اُن کے آئینۂ شعور میں بھی کبھی کوئی بال نہیں آیا۔ آج سے چودہ سو سال قبل عقلی بنیادوں پر دورانِ معراج آن کی آن میں ساتوں آسمانوں کی حدود سے گزر کر لامکاں تک جا پہنچنا اور اسی لمحے میں اس کھربوں نوری سال کی مسافت کو طے کر کے واپس سرزمینِ مکہ پر تشریف لے آنا تو کجا زمین کی بالائی فضا میں پرواز کا تصوّر بھی ناقابلِ یقین محسوس ہوتا ہے اور دُوسری طرف آج کا اِنسان اللہ ربّ العزّت کی عطا کردہ تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت عالمِ اَسباب کے اندر رہتے ہوئے اپنی کی سی اِتباعِ معجزۂ معراج میں کائنات کو مسخر کرنے کا عزم لے کر نکلا ہے۔ اگرچہ آج کا اِنسان صبح و شام فضائے بسیط میں محوِ پرواز ہے لیکن اگر واقعۂ معراج کو اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ حیطۂ شعور میں لایا جائے تو خلائی سفر کے مخصوص لوازمات کے بغیر کرّۂ فضا سے باہر ایتھر (Ather) میں کروڑوں نوری سال کا سفر طے کرنے کا تصوّر آج بھی ناممکن دِکھائی دیتا ہے۔

فضائے بالا کی مختلف کیفیّات

یہ کرۂ ارضی گیسوں پر مشتمل ایک ایسے شفّاف غلاف میں لپٹا ہوا ہے، جو زمین

پر زِندگی کوممکن بھی بناتا ہے اور شہابِ ثاقب کی بارِش میں اس پر پرورش پانے والی زندگی کوتحفظ کی رِدا بھی فراہم کرتا ہے۔ آج کے اس خلائی تحقیقات کے دور میں جب اِنسان خلاء کے سفر پر روانہ ہوتا ہے تو سب سے پہلے مرحلے میں اُسے سینکڑوں کلومیٹر کی گہرائی پر مشتمل زندگی بخش ہواؤں کے اِسی سمندر کو عبور کرنا ہوتا ہے۔

ہوائی سفر میں زیادہ بلندی پر آکسیجن کی کمی کی صورت میں گیس ماسک (Gas Mask) اِستعمال کیا جاتا ہے۔ جہاز کے اندر مصنوعی طور پر ہوا کا دباؤ (Air Pressure) بھی بنایا جاتا ہے اور اگر کسی تیکنیکی خرابی کی وجہ سے مکیّف (Air Tight) جہاز میں سوراخ ہو جائے تو جہاز کے اندر کا مصنوعی دباؤ تیزی سے گر جاتا ہے، جس سے مسافروں کے اَجسام سخت اِضمحلال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بعض صورتوں میں مسافروں کے منہ، ناک اور کانوں سے خون بھی بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر فوری طور پر دوبارہ مصنوعی دباؤ بنانا ممکن نہ ہو تو پائلٹ تیزی سے جہاز کی بلندی گراتے ہوئے اُسے اُس مخصوص سطح تک لے آتے ہیں، جہاں ہوا کا مناسب دباؤ موجود ہوتا ہے اور مسافر مزید پریشانی اور جانی نقصان سے بچ جاتے ہیں۔

خلائی سفر کی لابدّی ضروریات

خلائی سفر پر روانگی کے دوران کرۂ ہوائی (Atmosphere) سے باہر نکلنے کے لئے کم از کم 40,000 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار درکار ہوتی ہے۔ چنانچہ خلانوردوں (Astronauts) کو آکسیجن اور مصنوعی دباؤ کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص لباس ''Pressuresuit'' بھی درکار ہوتا ہے جو اُنہیں درجۂ حرارت کی شدّت کے علاوہ برقی مقناطیسی لہروں (Electro Magnetic Radiations) سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ EVA Spacesuit جو ایک اِنسان کو خلائی سفر کے

دوران آکسیجن کی فراہمی، مناسب حرارت، کمیونیکیشن اور خلاء میں قیام کے لئے دیگر ضروری سہولیات فراہم کرتا ہے، کے علاوہ Manned Maneuvering Unit (MMU) کی بدولت اِنسان اِس قابل بھی ہو چکا ہے کہ خلائی شٹل سے باہر نکل کر ایک مصنوعی سیارے کی طرح زمین کے مدار میں طویل وقت کے لئے بآسانی چہل قدمی کر سکے۔

تسخیرِ ماہتاب...... اِنسان کا بعید ترین خلائی سفر

ہوائی سفر کی مشکلات پر بتدریج قابو پایا جا رہا ہے اور اَب یہ سفر کسی حد تک محفوظ خیال کیا جاتا ہے لیکن خلائی سفر میں اِنسان کو فنی اور تیکنیکی پیچیدگیوں کا ہی سامنا نہیں کرنا پڑتا بلکہ نفسیاتی اُلجھنیں بھی اُس کا دامن تھام لیتی ہیں۔ خلاء کا سفر خطرات سے خالی نہیں، لیکن جذبۂ تسخیرِ کائنات عزم کو عمل کے سانچے میں ڈھالتا ہے تو اِنسان چاند کی سطح پر اپنی عظمت کا پرچم نصب کرنے کے بعد اپنے خلائی سفر کے اگلے مرحلے کی منصوبہ بندی میں مصروف ہو جاتا ہے۔ بیسویں صدی میں یہ کارنامہ سراِنجام دیا جا چکا ہے۔

خلائی تحقیقات کے امریکی اِدارے National Aeronautic Space Agency (NASA) کی طرف سے تسخیرِ ماہتاب کے لئے شروع کئے گئے دس سالہ اپالو مشن کے تحت جولائی 1969ء میں چاند کا پہلا کامیاب سفر کرنے والے Apolo-11 کے مسافر امریکی خلانورد 'نیل آرمسٹرانگ' (Neil Armstrong) اور 'ایڈون بُز' (Edwin Buzz) تاریخ اِنسانی کے وہ پہلے اَفراد تھے جو چاند کی سطح پر اُترے جبکہ اُن کا تیسرا ساتھی 'کولنز' (Collins) اُس دوران مصنوعی سیارے کی مانند چاند کے گرد محوِ گردش رہا۔ اِس دوران امریکی ریاست فلوریڈا

میں قائم زمینی مرکز Kennedy Space Center (KSC) میں موجود سائنسدان اُنہیں براہِ راست ہدایات دے رہے تھے۔ ضروری تجربات کے علاوہ مختلف ساخت کے چند پتھروں کے نمونے وغیرہ لے کر، روانگی سے محض دو دن بعد خلا نوردوں کا یہ مہم جو قافلہ واپس زمین پر آ گیا۔ اِس مہم کے دوران پل پل کی خبر ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعہ زمین کے مختلف خطوں میں بسنے والے اِنسانوں تک پہنچائی جاتی رہی۔ عالم اِنسانیت کی اِن خلائی فتوحات اور تسخیرِ ماہتاب کا ذِکر چودہ صدیاں قبل صحیفۂ کمال یعنی قرآنِ مجید میں پوری وضاحت کے ساتھ کر دیا گیا تھا۔ اِرشادِ خداوندی ہے:

وَ الْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ O لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ O فَمَا لَهُمْ لاَ يُؤْمِنُوْنَ O

(الانشقاق، ۸۴: ۱۸-۲۰)

قسم ہے چاند کی جب وہ پورا دکھائی دیتا ہے o تم یقیناً طبق در طبق ضرور سواری کرتے ہوئے جاؤ گے o تو اُنہیں کیا ہو گیا ہے کہ (قرآنی پیشینگوئی کی صداقت دیکھ کر بھی) اِیمان نہیں لاتے o

قرآنِ حکیم کے علاوہ بائبل سمیت دیگر صحائفِ آسمانی اور مذہبی کتب میں اِس قدر دُرُست سائنسی حوالے بالکل نہیں ملتے۔ درج بالا آیتِ مبارکہ میں تسخیرِ ماہتاب کا جو واضح اِشارہ ہے، بیسویں صدی کے اِنسان نے اُس اِشارے کی عملی تفسیر اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ آج کے اِنسان نے کامیابی و کامرانی کی اَن گنت منازِل طے کر لی ہیں۔ علومِ جدیدہ اِنسان کے ذِہن کو کشادگی بخش رہے ہیں۔ اُلجھی ہوئی گرہیں کھل رہی ہیں اور کائنات اپنی ازلی صداقتوں کے ساتھ نکھر کر اُس کے سامنے بےنقاب ہوتی چلی آ رہی ہے۔ لیکن اپنی تمام تر مادّی ترقی کے باوجود ابھی تک اِنسان روشنی کی رفتار سے سفر کرنے کی صلاحیّت حاصل نہیں کر سکا۔ روشنی 1,86,000 میل

(تین لاکھ کلومیٹر) فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے اور سائنس کی زبان میں اِس قدر رفتار کا حصول کسی بھی مادّی شیئے کے لئے محال ہے۔

روشنی کی رفتار کے حصول میں حائل رکاوٹیں

ممتاز سائنسدان 'البرٹ آئن سٹائن' نے 1905ء میں 'نظریۂ اضافیتِ مخصوصہ' (Special Theory of Relativity) پیش کیا۔ اُس تھیوری میں آئن سٹائن نے وقت اور فاصلہ دونوں کو تغیر پذیر قرار دیتے ہوئے واضح کیا کہ زمان و مکاں (Time & Space) کی گتھیاں اِس تھیوری کے کماحقہٗ اِدراک کے بغیر نہیں سلجھ سکتیں۔

آئن سٹائن نے ثابت کیا ہے کہ مادّہ (Matter) توانائی (Energy) کشش (Gravity) زمان (Time) اور مکان (Space) میں ایک خاص ربط اور ایک خاص نسبت پائی جاتی ہے۔ اُس نے یہ بھی ثابت کیا کہ اِن سب کی مطلقاً کوئی حیثیت نہیں۔ مثلاً جب ہم کسی وقت یا فاصلے کی پیمائش کرتے ہیں تو وہ اِضافی (Relative) حیثیت سے کرتے ہیں۔ گویا کائنات کے مختلف مقامات پر وقت اور فاصلہ دونوں کی پیمائش میں کمی وبیشی ممکن ہے۔ نظریۂ اِضافیت میں آئن سٹائن نے یہ بھی ثابت کیا کہ کسی بھی مادّی جسم کے لئے روشنی کی رفتار کا حصول ناممکن ہے اور ایک جسم جب دو مختلف رفتاروں سے حرکت کرتا ہے تو اُس کا حجم بھی اُسی تناسب سے گھٹتا اور بڑھتا ہے۔

آئن سٹائن برسوں کے غور وفکر کے بعد اِس نتیجے پر پہنچا کہ اِنتہائی تیز رفتار متحرّک جسم کی لمبائی اُس کی حرکت کی سمت میں کم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ روشنی کی 90% رفتار سے سفر کرنے والے جسم کی کمیّت دوگنا ہو جاتی ہے، جبکہ اُس کا حجم نصف رہ جاتا

ہے اوراس کے ساتھ ہی ساتھ وقت کی رفتار بھی اُس پر نصف رہ جاتی ہے۔

مثال: مثال کے طور پر اگر کوئی راکٹ 1,67,000 میل فی سیکنڈ (روشنی کی رفتار کا 90%) کی رفتار سے 10 سال سفر کرے تو اُس میں موجود خلانورد کی عمر میں صرف 5 سال کا اِضافہ ہوگا جبکہ زمین پر موجود اُس کے جڑواں بھائی پر 10 سال گزرنے کی وجہ سے خلانورد اُس سے 5 سال چھوٹا رہ جائے گا۔ آئن سٹائن نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اِنسانی جسم کی اِس محیّر العقول رفتار پر نہ صرف دِل کی دھڑکن اور دورانِ خون بلکہ اِنسان کا نظامِ اِنہضام اور تنفس بھی سست پڑ جائے گا۔ جس کا لازمی نتیجہ اُس خلانورد کی عمر میں کمی کی صورت میں نکلے گا۔

آئن سٹائن کے اِس نظریہ کے مطابق روشنی کی رفتار کا 90% حاصل کرنے سے جہاں وقت کی رفتار نصف رہ جاتی ہے، وہاں جسم کا حجم بھی سکڑ کر نصف رہ جاتا ہے اور اگر مادّی جسم اِس سے بھی زیادہ رفتار حاصل کر لے تو اُس کے حجم اور اُس پر گزرنے والے وقت کی رفتار میں بھی اُسی تناسب سے کمی ہوتی چلی جائے گی۔ اِس نظریئے میں سب سے دِلچسپ اور قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ **اگر بفرضِ محال کوئی مادّی جسم روشنی کی رفتار حاصل کر لے تو اُس پر وقت کی رفتار بالکل تھم جائے گی اور اُس کی کمیّت بڑھتے بڑھتے لامحدود ہو جائے گی اور اُس کا حجم سکڑ کر بالکل ختم ہو جائے گا، گویا جسم فنا ہو جائے گا۔** یہی وہ کسوٹی ہے جس کی بنیاد پر آئن سٹائن اِس نتیجے پر پہنچا کہ کسی بھی مادّی جسم کے لئے روشنی کی رفتار کا حصول ناممکن ہے۔

معجزۂ معراج میں برّاق کا سفر

آئن سٹائن کے نظریۂ اِضافیت (Theory of Relativity) کے مطابق روشنی کی رفتار کا حصول اور اُس کے نتیجے میں حرکت پذیر مادّی جسم پر وقت کا تھم

جانا اور اثر پذیری کھو دینا ناممکن ہے (کیونکہ اِس صورت میں مادّی جسم کی کمیّت لامحدود ہو جانے کے ساتھ ساتھ اُس کا حجم بالکل ختم ہو جائے گا)۔ آئن سٹائن کے نظریہ کی رُو سے یہی قانونِ فطرت پورے نظامِ کائنات میں لاگو ہے۔ اب اِس قانون کی روشنی میں سفرِ معراج کا جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ **''اللہ کی عادت''** کا یہ نظامِ فطرت اُس کی ''قدرت'' کے مظہر کے طور پر بدل گیا۔ وقت بھی تھم گیا...... جسم کی کمیّت بھی لامحدود نہ ہوئی، اور وہ فنا ہونے سے بچا رہا...... اُس کا حجم بھی جوں کا توں برقرار رہا...... اور خلائی سفر کی لابدّی مقتضیات پورے کئے بغیر سیاحِ لامکاں ﷺ نے برّاق کی رفتار (Multiple Speed of Light) سے سفر کیا، بیت المقدس میں تعدیلِ ارکان کے ساتھ نمازیں بھی ادا کیں، دورانِ سفر کھایا اور پیا بھی، لامکاں کی سیر بھی کی، اللہ کے برگزیدہ اَنبیاء کے علاوہ خود اللہ ربّ العزّت کا ''قَابَ قَوْسَيْن'' اور ''أَوْ أَدْنٰى'' کے مقاماتِ رِفعت پر جلوہ بھی کیا اور بالآخر سفرِ معراج کے اختتام پر واپس زمین کی طرف پلٹے تو تھما ہوا وقت آپ ﷺ کی واپسی کا منتظر تھا۔ وضو کا پانی بہہ رہا تھا، بستر ہنوز گرم تھا اور دروازے کی کنڈی ہل رہی تھی۔ اگرچہ معجزہ کسی مادّی توجیہہ کا محتاج نہیں لیکن اِس حقیقت کا اِدراک ہمیں ضرور ہونا چاہئے کہ سائنس سفرِ اِرتقاء کے ہر قدم پر معجزاتِ حضور ﷺ کی اتباع میں تسخیرِ کائنات کرتے ہوئے اِسلام کے اِلہامی مذہب ہونے کے بالواسطہ اِعتراف کا اِعزاز حاصل کر رہی ہے۔ نظریۂ اِضافیت میں روشنی کی عام رفتار کا حصول بھی ناممکن بنا کر پیش کیا گیا ہے، جبکہ حضور سرورِ کائنات ﷺ برّاق پر سوار ہو کر ہزارہا روشنیوں کی رفتار سے سفرِ معراج پر تشریف لے گئے۔ بُرّاق برق کی جمع ہے، جس کے معنی روشنی کے ہیں۔ آج کا اِنسان اپنی تمام تر مادّی ترقی کے باوجود روشنی کی رفتار کا حصول اپنے لئے ناممکن تصوّر کرتا ہے۔ یہ اِحساسِ محرومی اُسے اِحساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتا ہے، جبکہ تاجدارِ کائنات ﷺ روشنی سے بھی کئی گنا تیز رفتار برّاق پر سوار

ہو کر سفرِ معراج پر روانہ ہوئے۔ **معراج کا واقعہ علمِ اِنسانی کے لئے اِشارہ ہے کہ اِس کائناتِ رنگ و بو میں موجود عناصر ہی کی باہم کسی انوکھی ترکیب سے اِس بات کا قوِی اِمکان ہے کہ اِنسان روشنی کی رفتار کو پالے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو لاکھوں کروڑوں نوری سال کی مسافتوں میں بکھری ہوئی اِس کائنات کی تسخیر کا خواب اُدھورا رہ جائے گا۔** اِقبالؒ نے کہا تھا:

خبر ملی ہے یہ معراجِ مصطفٰی سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

معجزۂ معراج طیِ زمانی اور طیِ مکانی کی جامعیت کا مظہر

اب جدید سائنس بھی اپنی تحقیقات کو بنیاد بنا کر اِس کائناتی سچائی تک رسائی حاصل کر چکی ہے کہ رفتار میں کمی وبیشی کے مطابق کسی جسم پر وقت کا پھیلنا اور سکڑ جانا اور جسم کے حجم اور فاصلوں کا سکڑنا اور پھیلنا قوانینِ فطرت اور منشائے خداوندی کے عین موافق ہے۔ ربِّ کائنات نے اپنی آخری آسمانی کتاب قرآنِ مجید فرقانِ حمید میں طیِ زمانی اور طیِ مکانی کی بعض صورتوں کا ذِکر فرما کر بنی نوع اِنسان پر یہ واضح کر دیا ہے کہ اِنسان تو بیسویں صدی میں اپنی عقل کے بل بوتے پر وقت اور جگہ (Time & Space) کے اِضافی (Relative) تصوّرات کو اپنے حیطۂ اِدراک میں لانے میں کامیاب ہوگا لیکن ہم ساتویں صدی عیسوی کے اوائل ہی میں اپنی وحی کے ذریعہ اپنے محبوب رسول ﷺ پر اِن کائناتی سچائیوں کو منکشف کر رہے ہیں۔

طیِ مکانی

لاکھوں کروڑوں کلومیٹرز کی وُسعتوں میں بکھری مسافتوں کے ایک جنبشِ

قدم میں سمٹ آنے کو اِصطلاحاً ’طیِ مکانی‘ کہتے ہیں۔

طیِ زمانی

صدیوں پر محیط وقت کے چند لمحوں میں سمٹ آنے کو اِصطلاحاً ’طیِ زمانی‘ کہتے ہیں۔

خدائے قدیر وخبیر اپنے برگزیدہ انبیائے کرام اور اولیائے عظام میں سے کسی کو معجزہ اور کرامت کے طور پر طیِ زمانی اور کسی کو طیِ مکانی کے کمالات عطا کرتا ہے لیکن حضور رحمتِ عالم ﷺ کا سفرِ معراج معجزاتِ طیِ زمانی اور طیِ مکانی دونوں کی جامعیت کا مظہر ہے۔ سفر کا ایک رخ اگر طیِ زمانی کا آئینہ دار ہے تو اُس کا دوسرا رخ طیِ مکانی پر محیط نظر آتا ہے۔ معراج النبی ﷺ کے دوران میں اِن معجزات کا صدور نصِ قرآن و حدیث سے ثابت ہے، جن کی صحت میں کسی صاحبِ ایمان کے لئے اِنحراف کی گنجائش نہیں۔

قرآنِ حکیم میں طیِ مکانی کا ذکر

حضرت سلیمان علیہ السلام ملکہ سبا ’’بلقیس‘‘ کے تخت کے بارے میں اپنے درباریوں سے سوال کرتے ہیں:

قَالَ يٰاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَO

(النمل، ۲۷:۳۸)

(حضرت سلیمان علیہ السلام نے) فرمایا: اے دربار والو! تم میں سے کون اُس (ملکہ) کا تخت میرے پاس لاسکتا ہے، قبل اِس کے کہ وہ لوگ فرمانبردار ہو کر میرے پاس آ جائیںO

ملکۂ سبا بلقیس کا تخت دربارِ سلیمان علیہ السلام سے تقریباً 900 میل کے فاصلے پر پڑا ہوا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام چاہتے تھے کہ ملکۂ سبا جو مطیع ہو کر اُن کے دربار میں حاضر ہونے کے لئے اپنے پایۂ تخت سے روانہ ہو چکی ہے، اُس کا تخت اُس کے آنے سے قبل ہی سرِ دربار پیش کر دیا جائے۔ قرآنِ مجید کہتا ہے:

قَالَ عِفْرِيْتٌ مِنَ الْجِنِّ أَنَا اٰتِيْکَ بِهٖ قَبْلَ أَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِکَ وَ إِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ أَمِيْنٌO (النمل، ۲۷:۳۹)

ایک قوی ہیکل جن نے عرض کیا: ''میں اُسے آپ کے پاس لا سکتا ہوں قبل اِس کے کہ آپ اپنے مقام سے اُٹھیں اور بے شک میں اُس (کے لانے) پر طاقتور (اور) امانتدار ہوں O

قرآنِ مجید کی اس آیتِ کریمہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کے دربار کے ایک جن کو قاعدۂ طئی مکانی کے تحت یہ قدرت حاصل تھی کہ وہ دربار برخاست ہونے سے پہلے 900 میل کی مسافت سے تختِ بلقیس لا کر حاضر کر دے لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کو اِتنی تاخیر بھی گوارا نہ ہوئی۔ اس موقع پر آپ کا ایک صحابی 'آصف بن برخیا' جس کے پاس کتابُ اللہ کا علم تھا، خود کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ اِس اَنداز کو قرآنِ کریم نے اِس طرح بیان فرمایا:

قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْکِتٰبِ أَنَا اٰتِيْکَ بِهٖ قَبْلَ أَنْ يَّرْتَدَّ إِلَيْکَ طَرْفُکَ ط فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ۔

(پھر) ایک ایسے شخص نے عرض کیا جس کے پاس (آسمانی) کتاب کا کچھ علم تھا کہ میں اُسے آپ کے پاس لا سکتا ہوں قبل اِس کے کہ آپ کی نگاہ آپ کی طرف پلٹے۔ پھر جب سلیمان

(النمل، ۲۷:۴۰) (سلیمان علیہ السلام) نے اُس (تخت) کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا (تو) کہا یہ میرے رب کا فضل ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک برگزیدہ صحابی آنکھ جھپکنے سے پیشتر تختِ بلقیس اپنے نبی کے قدموں میں حاضر کر دیتا ہے۔ یہ طیِّ مکانی کی ایک نا قابلِ تردید قرآنی مثال تھی کہ فاصلے سمٹ گئے، جسے قرآن حکیم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک اُمتی سے منسوب کیا ہے۔ **اگر اِس کرامت کا صدور حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک اُمتی سے ہوسکتا ہے تو اِس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نبی آخرالزّماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کے نفوسِ قدسیہ کے کمالات کی کیا حد ہوگی!** مردِ مومن کا اِشارہ پاتے ہی ہزاروں میل کی مسافت اُس کے ایک قدم میں سمٹ آتی ہے اور اُس کے قدم اُٹھانے سے پہلے شرق و غرب کے مقامات زیرِ پا آ جاتے ہیں۔ بقول علامہ اقبالؒ:

دو نیم اُن کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ اُن کی ہیبت سے رائی

قرآنِ حکیم میں طیِّ زمانی کا ذکر

قرآن ہر علم، حکمت اور دانائی کا سرچشمہ ہے جو کائنات کے رازہائے سربستہ کو ذہنِ اِنسانی پر مُنکشف کرتا ہے اور اُس میں شعور و آگہی کے اَن گنت چراغ روشن کرتا ہے۔ طیِّ زمانی کا ذِکر بھی ربِّ اَرض و سماوات کی آخری اِلہامی کتاب میں پوری وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ اَصحابِ کہف اور حضرت عزیر علیہ السلام کے واقعات طیِّ زمانی کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ اِن دونوں واقعات میں خرقِ عادت اور محیّر العقول

میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ یہ دونوں واقعات اِسی کرۂ ارضی پر وُقوع پذیر ہوئے اور طیٔ زمانی کے حصول کے لئے سماوِی کائنات (Outer Cosmos) میں روشنی کی رفتار سے سفر نہیں کیا گیا، مگر پھر بھی ظہورِ قدرتِ الٰہیہ کا نظارہ کیا عجب ہے کہ وقت تھم گیا اور مادّی اَجسام بھی محفوظ رہے اور صدیوں پر محیط عرصہ بھی بیت گیا۔

اَصحابِ کہف اور طیٔ زمانی

قرآنِ حکیم طیٔ زمانی کی مثال اصحابِ کہف کے حوالے سے یوں بیان کرتا ہے کہ تین سونو سال تک وہ ایک غار میں لیٹے رہے اور جب سوکر اُٹھے تو انہیں یوں گمان ہوا گویا وہ محض ایک دن یا دن کا کچھ حصہ سوئے رہے ہیں۔ قرآنِ مجید اِس محیرالعقول واقعہ کو اِن اَلفاظ میں بیان کرتا ہے:

قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ۔

(الکہف، ۱۸:۱۹)

اُن میں سے ایک کہنے والے نے کہا: ''تم (یہاں) کتنا عرصہ ٹھہرے ہو''؟ اُنہوں نے کہا: ''ہم (یہاں) ایک دن یا اُس کا (بھی) کچھ حصہ ٹھہرے ہیں''۔

309 سال گزر جانے کے باوجود اُنہیں یوں محسوس ہوا کہ ایک دن بھی نہیں گزرنے پایا اور اُن کے اجسام پہلے کی طرح تروتازہ اور توانا رہے۔ طیٔ زمانی کی یہ کتنی حیرت انگیز مثال ہے کہ مدتِ مدید تک اصحابِ کہف اور اُن کا کتا غار میں مقیم رہے اور مُرورِ ایام سے اُنہیں کوئی گزند نہ پہنچا۔ قرآنِ مجید کے اِس مقام کے سیاق و سباق کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو اصحابِ کہف کے حوالے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ اپنے غار میں 309 سال تک آرام فرما رہے۔ کھانے پینے سے بالکل بے نیاز قبر کی سی حالت میں 309 سال تک اُن کے جسموں کو گردشِ لیل و نہار سے پیدا ہونے والے

اَثرات سے کلیتاً محفوظ رکھا گیا۔ سورج رحمتِ خداوندی کے خصوصی مظہر کے طور پر اُن کی خاطر اپنا راستہ بدلتا رہا تاکہ اُن کے جسم موسمی تغیرات سے محفوظ و مامون اور صحیح وسالم رہیں۔ 309 قمری سال 300 شمسی سالوں کے مساوِی ہوتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ کرۂ ارضی کے 300 سالوں کے شمسی موسم اُن پر گزر گئے مگر اُن کے اَجسام تروتازہ رہے۔ تین صدیوں پر محیط زمانہ اُن پر اِنتہائی تیز رفتاری کے ساتھ گزر گیا اور وہ بیدار ہونے پر صدیوں پر محیط اُس مدت کو محض ایک آدھ دِن خیال کرتے رہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص نشانی اور **قدرتِ الٰہیہ** کا ظہور تھا جس سے **عادتِ الٰہیہ** کے پیمانے سمٹ گئے۔ قرآنِ مجید فرماتا ہے:

وَ تَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوُرَ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ إِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِنْهُ ط

(الکہف، ۱۸:۱۷)

اور آپ دیکھتے ہیں جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اُن کے غار سے دائیں جانب ہٹ جاتا ہے اور جب غروب ہونے لگتا ہے تو اُن سے بائیں جانب کترا جاتا ہے اور وہ اُس کشادہ میدان میں (لیٹے) ہیں۔

اللہ کی وہ خاص نشانی جس کا ظہور اُس نے اصحابِ کہف کی کرامت کے طور پر کیا، یہ ہے کہ اُس نے اپنے مقربین کو ظالم بادشاہ کے شر سے محفوظ رکھنے کے لئے 309 قمری سال تک سورج کے طلوع وغروب کے اُصول تک بدل دیئے اور **ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ** کی رُو سے ایک معین نظامِ فلکیات کو سورج کے گرد زمین کی 300 مکمل گردشوں تک کے طویل عرصے کے لئے تبدیل کر دیا گیا اور فطری ضابطوں کو بدل کر رکھ دیا گیا۔

خدائے رحمٰن ورحیم نے اپنی خصوصی رحمت سے اصحابِ کہف کو تھپکی دے کر پُر کیف نیند سلا دیا اور اُن پر عجیب سرشاری کی کیفیت طاری کر دی۔ پھر اُنہیں ایک ایسے مشاہدۂ حق میں مگن کر دیا کہ صدیاں ساعتوں میں تبدیل ہوتی محسوس ہوئیں۔ جیسا کہ قیامت کا دِن بھی طیِ زمانی ہی کی ایک صورت میں برپا ہوگا، جس میں پچاس ہزار سال کا دِن اللہ کے نیک بندوں پر عصر کی چار رَکعتوں کی اَدائیگی جتنے وقت میں گزر جائے گا، جبکہ دیگر لوگوں پر وہ طویل دِن ناقابلِ بیان کرب واَذیت کا حامل ہوگا۔ مشاہدۂ حق کے اِستغراق میں وقت سمٹ جاتا ہے اور صدیاں لمحوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

؎ مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جُدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

حضرت عُزیر علیہ السلام اور طیِ زمانی

طیِ زمانی کی ایک اور مثال قرآنِ حکیم نے حضرت عزیر علیہ السلام کے قصے میں بیان کی ہے۔ انہوں نے حصولِ حق الیقین کے لئے اللہ تعالیٰ سے طیِ زمانی کے بارے میں سوال کیا۔ اُن کے سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے بطورِ مشاہدہ اُن پر ایک سو سال کے لئے موت طاری کر دی اور پھر بعد ازاں قدرتِ خداوندی ہی سے وہ زِندہ ہوئے۔ قرآن کہتا ہے:

فَأَمَاتَهُ اللهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ؟

(البقرہ،۲:۲۵۹)

سو (اپنی قدرت کا مشاہدہ کرانے کے لئے) اُسے سو برس تک مُردہ رکھا۔ پھر اُسے زندہ کیا۔ (بعدازاں) پوچھا: ''تو یہاں (مرنے کے بعد) کتنی دیر ٹھہرا رہا (ہے)''؟

ایک صدی تک موت کی آغوش میں سوتے رہنے کے بعد جب حضرت عُزیر علیہ السلام کو اللہ ربّ العزّت کی طرف سے نئی زندگی عطا ہوئی، تو اُن سے یہ پوچھا گیا کہ کتنا عرصہ لیٹے رہے؟ تو انہوں نے جواب دیا:

لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ۔	''میں ایک دن یا ایک دن کا (بھی) کچھ حصہ ٹھہرا ہوں''۔ فرمایا: ''(نہیں) بلکہ تو سو برس پڑا رہا (ہے)''۔
	(البقرہ، ۲:۲۵۹)

حضرت عزیر علیہ السلام کو اصل صورتحال سے آگاہ کیا گیا کہ اُنہیں تو لیٹے ہوئے 100 سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اُن کے پاس کھانے کا جو سامان تھا وہ بھی جوں کا توں تر و تازہ رہا اور اُس میں کوئی عفونت پیدا نہ ہوئی۔ حضرت عزیر علیہ السلام کی توجہ اس طرف دِلانے کے لئے اِرشاد ہوا:

فَانْظُرْ إِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ۔	پس اب تو اپنے کھانے اور پینے (کی چیزوں) کو دیکھ (وہ) متغیر (باسی) بھی نہیں ہوئیں۔
	(البقرہ، ۲:۲۵۹)

قدرتِ خداوندی ہے کہ ایک طرف تو حضرت عزیر علیہ السلام کے طعام اور مشروب میں عفونت اور سرانڈ تک پیدا نہ ہوئی اور وہ جوں کے توں تر و تازہ رہے جبکہ دُوسری طرف اللہ کے پیغمبر کے گدھے کی ہڈیاں بھی گل سڑ کر پیوندِ خاک ہوگئیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ کے سامنے اُس گدھے کی ہڈیاں اکٹھی ہوئیں اور وہ زِندہ سلامت کھڑا ہوگیا۔

جدید ترین سائنسی تحقیقات بھی طیِّ زمانی کی تصدیق کر رہی ہیں اور اِس کوشش میں ہیں کہ کسی لاعلاج مریض پر مصنوعی موت طاری کر کے اُسے طویل مدّت تک سرد خانے میں محفوظ رکھا جائے اور جب اُس کے مرض کا علاج دریافت ہو جائے تو

اُس کے جسم میں دوبارہ سے زِندگی کی لہر دوڑا کر اُس مریض کا علاج کیا جائے اور ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد اُسے ایک بار پھر روزمرّہ کے معمولات کی ادائیگی کے قابل بنا دیا جائے۔ عین ممکن ہے کہ اُس وقت تک اُس کی اپنی اولاد میں سے کئی نسلیں موت سے ہمکنار ہو چکی ہوں۔ اِنسان کا یہ خواب اَب خواب نہیں رہے گا۔

جدید سائنس اپنے اِرتقاء کے ساتھ ساتھ قرآنِ مجید میں درج سائنسی حقائق کی توثیق کرتی چلی جا رہی ہے۔ مغرب کے سائنسدان اپنے تمام تر تعصّبات کے باوجود قرآن کو اِلہامی کتاب تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ آج نہیں تو کل عقلی بنیادوں پر تشکیل پانے والا ذہن جدید تعلیماتِ اِسلامی کی سچائیوں کے اِعتراف میں پیش پیش ہوگا، اِس لئے آنے والی ہر صدی اِسلام کی صدی ہے۔ مغربی دُنیا کے پاس اِسلامی تعلیمات کی حقّانیت کو تسلیم کرتے ہوئے اِس کے دامنِ رحمت میں پناہ ڈھونڈنے کے سِوا کوئی چارہ نہ ہوگا اور مصطفوی اِنقلاب کا سورج مغرب کے اُفق پر بھی اپنی تمام تر تخلیقی توانائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوگا۔ زمین پر اُترنے والا ہر لمحہ اللہ کی توحید اور حضور ﷺ کی رسالت کی گواہی دے رہا ہے۔

قرآنِ مجید میں مذکور حضرت عزیر علیہ السلام کی اِس مثال میں طیِ زمانی کا کیا منظر تھا کہ 100 سال کا عرصہ گزر گیا اور اس کے باوجود اُن کے مادّی جسم کو کوئی گزند نہ پہنچا اور وہ موسموں کے تغیر و تبدّل سے پیدا ہونے والے اَثرات سے محفوظ رہا۔ وقت اُن کے کھانے پینے کی اشیاء پر بھی اِس طرح سمٹ گیا کہ اُن کی تر و تازگی میں بھی کوئی فرق نہ آیا، لیکن وُہی ایک صدی اللہ کے نبی کے گدھے پر اِس طرح گزری کہ اُس کا نام و نشان تک مٹ گیا۔ حتیٰ کہ اُس کی ہڈیاں تک بکھر گئیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اِحیائے موتی' کا نظّارہ کرانے کے لئے اُن کے گدھے پر تجلّی کی تو 100 سالہ مُردہ گدھے کی ہڈیاں اِکٹھی ہوئیں، اُن پر گوشت پوست چڑھ گیا اور دیکھتے ہی

دیکھتے وہ زِندہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ قادرِ مطلق نے چشمِ زدن میں حضرت عزیر علیہ السلام کو طئ زمانی اور اِحیائے موتیٰ کے منظر دِکھلا دیئے۔

معراجِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور طئ زمانی و مکانی

خدا کی ذات اگر بنی اِسرائیل کے ایک پیغمبر کو اپنی **قدرتِ خاص** کے کرِشمے دِکھا سکتی ہے تو اپنے حبیب نبئ آخرالزّماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاطر اِس سے بڑھ کر معجزے کیوں برپا نہیں کر سکتی؟ اِس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ شبِ معراج صاحبِ لولاک فخرِ موجودات حضور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زمان و مکاں (Time & Space) کی مسافتیں طے کروانے کے بعد خدائے لم یزل نے اپنے قرب و وصال کی بے پایاں نعمتیں عطا فرما دیں۔ مقامِ قَابَ قَوْسَيْن پر اپنی ہمکلامی اور بے حجاب دِیدار کا شرف اِس طرح اَرزانی فرمایا کہ ایک طرف خدا اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سمیع و بصیر تھا تو دوسری طرف حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے خدا کا سمیع و بصیر تھا، اور دونوں کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ تھا۔

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِه	کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِهٖ
حَسُنَتْ جَمِيْعُ خِصَالِهٖ	صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ آلِهٖ

شبِ معراج تاجدارِ کائنات رسولِ کون و مکاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیا کیا مقامات عطا ہوئے! اُنہیں عظمت و رِفعت کی کن بلندیوں سے ہمکنار کیا گیا! اِرتقائے نسلِ اِنسانی کو تسخیرِ کائنات کے مقفّل دروازوں پر دستک دینے کی کس طرح ترغیب دی گئی! اُس شب کتنی مسافتیں طے ہوئیں اور کتنے زمانے بیت گئے! اِس کا حال اللہ ربّ العزّت اور اُس کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سِوا کوئی نہیں جانتا اور نہ جان ہی سکتا ہے۔ ہم غلامانِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو بس اِتنا جانتے ہیں کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاطر پوری خدائی کی

طنابیں کھینچ لی گئیں۔ چرخِ نیلوفری دَم بخود تھا کہ یہ کون مہمانِ مکرم لامکاں کی سیر کو نکلا ہے۔ ستارے حیرت کی تصویر بنے رہگزرِ مصطفیٰ ﷺ کی گرد کو اپنے ماتھے کا جھومر بنا رہے تھے۔ وقت کی نبضیں ایک جگہ تھمی کی تھمی رہ گئیں اور کائنات بے حس و حرکت اور ساکت اپنے رُوحِ رواں کے اِنتظار میں ایک نقطے پر ٹھہری رہی۔ حضور ﷺ کے زمانۂ نبوت میں عقلِ اِنسانی نے کرۂ ارضی پر محیط فضا کے غلاف کو عبور کرتے ہوئے چاند پر پہنچ کر معجزۂ معراجِ مصطفوی ﷺ کے اِمکان کی نشاندہی تو کر دی لیکن اُس منزل تک پہنچنا معجزہ ہے اور سیارگانِ فلکی تک پہنچنا اُس منزل کی تائید اور سفرِ معراج کی توثیق ہے، فرمانِ مصطفیٰ ﷺ کی تصدیق ہے اور یہ تائید و توثیق فقط نشاندہی کی حد تک ہے کیونکہ اگر عقلِ اِنسانی بھی منزلِ مصطفوی ﷺ تک پہنچ جائے تو پھر نبوت کا معجزہ ہی باقی نہ رہے۔ اِس لئے اِنسان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں جتنی بھی ترقی کر لے آسمان کی حدود کو پھلانگ کر اور مکاں کی حدوں کو چھوڑ کر کبھی وہ لامکاں کی بلندیوں میں داخل نہیں ہوسکتا۔ سفرِ معراج کے نقوشِ پا کو چومنا تو اُس کا مقدّر بن سکتا ہے لیکن منزلِ مصطفیٰ ﷺ تک رسائی روزِ قیامت تک اُس کے لئے ممکن نہ ہو سکے گی۔ علامہ محمد اِقبالؒ نے فرمایا:

تو معنیٔ ’’وَالنَّجْم‘‘ نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مدّ و جزر ابھی چاند کا محتاج

باب سوم

معجزہ معراجِ النبی ﷺ

سفرِ معراج......نقوشِ کفِ پائے مصطفیٰ ﷺ کی چاندنی

معجزۂ معراج تاریخِ ارتقائے نسلِ انسانی کا وہ سنگِ میل ہے جسے قصرِ ایمان کا بنیادی پتھر بنائے بغیر تاریخ بندگی مکمل نہیں ہوتی اور روح کی تشنگی کا مداوا نہیں ہوتا۔ معراج النبی ﷺ تاریخِ انسانی کا ایک ایسا حیرت انگیز، انوکھا اور نادر الوقوع واقعہ ہے جس کی تفصیلات پر عقلِ ناقص آج بھی حیران وششدر ہے۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا کہ سفرِ معراج کیونکہ طے ہوا؟ عقل حیرت کی تصویر بن جاتی ہے، مادی فلسفہ کی خوگر، اربعہ عناصر کی بے دام باندی عقلِ ناقص یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ انسانِ کامل حدودِ سماوِی کو عبور کر کے آسمان کی بلندیاں طے کرتا ہوا لامکاں کی وسعتوں تک کیسے پرواز کر سکتا ہے اور وہ کچھ دیکھ لیتا ہے جسے دیکھنے کی عام انسانی نظر میں تاب نہیں۔ اس لئے حدود و قیود کے پابند لوگ اس بے مثال سفرِ معراج کے عروج وارتقاء پر انگشت بدنداں ہیں اور اسے مِن وعَن اور مستند انداز سے مذکورہ تفصیلات کے ساتھ بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور ایسے ایسے شبہات وارد کرتے ہیں اور تشکیک کا ایسا غبار اُڑاتے ہیں کہ دلائل سے غیر مسلح ذہن اور عام آدمی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور دیوارِ ایمان متزلزل سی ہونے لگتی ہے۔

نبیٔ آخرالزماں ﷺ کے معجزات میں معجزۂ معراج خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ تاریخِ انبیاء کی ورق گردانی کی جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اپنے برگزیدہ

رسولوں اور نبیوں کو اللہ رب العزت نے اپنے خصوصی معجزات سے نوازا۔ ہر نبی کو اپنے عہد، اپنے زمانے اور اپنے علاقے کے حوالے سے معجزات سے نوازا تاکہ ان کی حقانیت ہر فردِ بشر پر آشکار ہو اور وہ ایمان کی دولت سے سرفراز کیا جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت چونکہ جادو میں کمال رکھتی تھی، ہزاروں جادوگر دربارِ شاہی سے وابستہ ہوتے، اس لئے خالقِ کائنات نے بھی اپنے نبی کو جادو کے ان کمالات کا توڑ کرنے کے لئے معجزات عطا کئے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں طب کا بڑا چرچا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو بھی زندہ کر دینے کی قدرت سے فیض یاب تھے۔ کوڑھیوں کو تندرست کر دیتے کہ اس زمانے میں طب کا دور دورہ تھا اور انسانی نفسیات کو یہی بات زیادہ Apeal کرتی ہے۔ ہر نبی اپنے وقت کے ہر کمال سے آگے ہوتا ہے۔ امت جس کمال پر فائز ہوتی ہے نبی اس کمال پر بھی حاوی ہوتا ہے۔

اب نبی آخر الزماں ﷺ کو تشریف لانا تھا۔ بابِ نبوت و رسالت حضور ﷺ کے ساتھ بند ہو رہا تھا۔ ختمِ نبوت کا تاج سرِ اقدس پر سجایا گیا۔ آپ ﷺ خاتم المرسلین قرار پائے چنانچہ آقائے دوجہاں ﷺ کو ایسے معجزات سے نوازا گیا جن کا مقابلہ تمام زمانوں کی قومیں مل کر بھی نہ کر سکتی تھیں۔ اللہ رب العزت کو معلوم تھا کہ امتِ محمدی چاند پر قدم رکھے گی اور ستاروں پر کمندیں ڈالے گی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی ﷺ کو مکان و لامکاں کی وسعتوں میں سے نکال کر اپنے قرب کی حقیقت عطا فرمائی جس کا گمان بھی عقل انسانی میں نہیں آ سکتا تھا۔ حضور ﷺ کے باقی تمام معجزات اور دیگر انبیاء و رسل کے تمام معجزات ایک طرف اور حضور ﷺ کا معجزۂ معراج ایک طرف، تمام معجزات مل کر بھی معجزۂ معراج کی ہمہ گیریت اور عالمگیریت کو نہیں پہنچ سکتے۔ یہ حضور ﷺ کا دائمی معجزہ ہے جس کی عظمت میں وقت کا سفر طے ہونے کے ساتھ ساتھ اضافہ

ہوتا جائے گا اور نئے نئے کائناتی انکشافات سامنے آ کر معجزۂ معراج کی حقانیت کی گواہی دیتے رہیں گے۔ اِرتقاء کے سفر میں اٹھنے والا ہر قدم سفرِ معراج میں نقوشِ کفِ پا کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ آقائے دو جہاں ﷺ نے فرمایا کہ میں مکہ سے اٹھا اور براق پر سوار ہو کر بیت المقدس پہنچا، وہاں سے آسمانوں اور پھر وہاں سے عرشِ معلّٰی تک گیا حتیٰ کہ مکان و لا مکاں کی وسعتیں طے کرتا ہوا مقامِ قاب وقوسین پر پہنچا اور پھر حسنِ مطلق کا بے نقاب جلوہ کیا۔ انبیائے کرام سے ملاقاتیں کیں، جب لوٹا تو گھر کے دروازے کی کنڈی ہل رہی تھی اور غسل و وضو کا پانی حرکت میں تھا۔ ابولہب اور ابوجہل کی عقل آڑے آ گئی۔ غبارِ تشکیک نے حقائق کو چھپا لیا جبکہ ابوبکرؓ عشق کی بازی جیت گئے اور صدیق کے لقب سے ملقّب ہوئے۔ انسان کا سفرِ ارتقاء نقوشِ کفِ پائے مصطفٰی ﷺ کی تلاش کا نام ہے۔

سفرِ معراج عالمِ بیداری میں طے ہوا

آج کے سائنسی دور کے اِرتقاء اور کائناتی انکشافات کے اس دور میں بھی اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں نے خواب میں زمینوں اور آسمانوں کی سیر کی اور جب میں واپس آیا تو میرا بستر گرم تھا تو اسے مِن وعن تسلیم کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ خواب کی بات ہے اور خواب میں ایسا ہونا ممکن ہے۔ اگر حضور ﷺ بھی یہ دعویٰ خواب کے حوالے سے کرتے تو ابولہب کو اس کی حقانیت سے انکار ہوتا اور نہ ابوجہل کو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دعویٰ عالمِ بیداری میں کیا گیا کہ آسمانوں اور زمینوں کی سیر میں نے عالمِ بیداری میں کی، اس لئے عقلِ عیار اسے تسلیم کرنے پر تیار نہ ہوئی۔ اب چونکہ جاگتے ہوئے یہ سب کچھ ہونا انسانی فہم و اِدراک سے بالاتر تھا لہٰذا اس معجزہ کو اہلِ ایمان کے لئے ان کے ایمانوں کی آزمائش قرار دیا گیا۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِیٓ اَرَیْنَاکَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ۔
(بنی اسرائیل، ۱۷:۶۰)

اور ہم نے تو (شبِ معراج کے) اس نظارہ کو جو ہم نے آپ کو دکھایا لوگوں کے لئے صرف ایک آزمائش بنایا ہے (ایمان والے مان گئے اور ظاہر بین اُلجھ گئے۔)

بعض لوگ یہ سمجھتے کہ رویا چونکہ عام طور پر خواب کے معنیٰ میں استعمال کیا جاتا ہے لہٰذا حضور ﷺ کو سفرِ معراج خواب میں عطا ہوا۔ درحقیقت یہ مفہوم غلط ہے۔ عربی زبان میں رؤیاء رات کے وقت کھلی آنکھوں سے دیکھنے کو بھی کہتے ہیں اور دورِ جاہلیت کے کئی عرب شعراء کا کلام بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے۔ یہاں رویاء سے مراد مطلق مشاہدہ ہے۔ اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے کہا:

لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا۔
(بنی اسرائیل، ۱۷:۱)

تاکہ ہم اس (بندۂ کامل) کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔

چونکہ یہ چیز کسی بھی شخص کے لئے عملاً ناممکن تھی لہٰذا اللہ رب العزت نے اسے اپنی قدرتوں کی طرف منسوب کیا اور فرمایا:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلاً۔
(بنی اسرائیل، ۱۷:۱)

(کہ ہر نقص، عیب اور ناممکن کے لفظ سے) پاک ہے وہ قادرِ مطلق جو لے گیا اپنے بندے کو رات کے وقت سیر کرانے۔

کفار و مشرکینِ مکہ کا ردِّ عمل ہی ظاہر کرتا ہے کہ معجزۂ معراج کوئی معمولی واقعہ تھا اور نہ یہ کوئی خواب ہی بیان ہو رہا تھا۔ اگر یہ خواب ہوتا تو کفار و مشرکین کا ایسا منکرانہ ردِّ عمل سامنے آتا اور نہ قرآن میں اس کا ذکر اس اہتمام سے ہوتا۔ **الشفاء**

بتعریف حقوقِ المصطفٰی میں قاضی عیاضؒ نے اپنی تحقیق کے مطابق ان صحابہؓ و ائمہ کرامؒ کو جسمانی معراج پر ایمان رکھنے والا کہا ہے:

و ذهب معظم السلف و المسلمين إلى أنه إسراء بالجسد و فى اليقظة و هذا هو الحق وهو قول إبن عباس و جابر و أنس و حذيفة و عمر و أبى هريرة و مالک بن صعصعة و أبى حبة البدرى و ابن مسعود و الضحاک و سعيد بن جبير و قتاده و ابن المسيب و ابن شهاب و ابن زيد و الحسن و إبراهيم و مسروق و مجاهد و عكرمة و ابن جريج و هو دليل قول عائشة وهو قول الطبرى و ابن حنبل و جماعة عظيمة من المسلمين وهو قول أكثر المتأخرين من الفقهاء و المحدثين و المتكلمين و المفسرين۔

(الشفاء،۱:۱۸۸)

اسلاف اور مسلمانوں کی اکثریت اسراء کو جسم کے ساتھ بیداری میں ہونے پر ایمان رکھتی ہے اور یہی سچا قول ہے۔ اس قول میں ابن عباسؓ، جابرؓ، انسؓ، حذیفہؓ، عمرؓ، ابوہریرہؓ، مالک بن صعصعہؓ، ابوحبہ البدریؓ، ابن مسعودؓ، ضحاکؓ، سعید بن جبیرؓ، قتادہ ابن المسیبؒ، ابن شہابؒ، ابن زیدؒ، حسنؒ، ابراہیمؒ، مسروق، مجاہدؒ، عکرمہؒ، ابن جریجؒ وغیرہ شریک ہیں اور یہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے قول پر دلیل ہے اور یہ قول طبریؒ، ابن حنبلؒ کے علاوہ مسلمانوں کی غالب اکثریت کا بھی ہے اور متاخرین فقہاء محدثین اور متکلمین و مفسرین کا بھی یہی قول ہے۔

انسان ظاہر و باطن کا پیکرِ دلنشیں ہے۔ داخل سے خارج تک اور خارج سے داخل تک کا سفر اَن گنت مراحل کا امین ہوتا ہے۔ باطن ایک شفاف آئینہ ہے جس میں ظاہر کی دنیا کا ہر عکس جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس طرح ظاہر بھی من کی دنیا کا عکاس ہے۔ باطن کے پانچ لطائف ہوتے ہیں۔ قلب، روح، سِرّ، خفی اور اخفٰی۔ سفرِ معراج عالمِ بیداری میں طے ہوا۔ اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ یہ معراج یک جہتی نہ تھی بلکہ تاجدارِ کائنات ﷺ کو عطا ہونے والی معراج تمام لطائف کی بھی معراج تھی۔ وہ ایسے کہ ہر لطیفے کا مقام اپنی جگہ سے اٹھ کر اوپر کے مقام پر چلا گیا یعنی جسمِ اطہر جو نفس کا مظہر تھا جب مقامِ قاب قوسین پر پہنچا تو وہ آقائے دو جہاں ﷺ کا جسمِ اطہر تھا لیکن جسم کے مقام سے اٹھ مرتبہ قلب پر پہنچ گیا تھا۔ یہ بات اگر سمجھ میں آ جائے تو یہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ شبِ معراج حضور ﷺ نے اللہ پاک کا دیدار سر کی آنکھوں سے کیسے کیا۔ اصل بات یوں ہے کہ اس سلسلے میں دو روایات ملتی ہیں:

۱۔ اُمُ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جس شخص نے حضور ﷺ کی نسبت اللہ جل شانہ کو سر کی آنکھوں سے دیکھنے کا دعویٰ کیا، اس نے کفر کیا۔ اسکو امام بخاریؒ نے اس روایت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

عن مسروق، قال: سالت عائشةؓ عن هذه الآية التی فیها الرویة فقالت: انا اعلم هذه الامة بهذه، وانا سالت رسول الله ﷺ عن ذالک قال: رأیت جبرئیل ثم قالت: من زعم ان محمداً رای ربه فقد

مسروق بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ سے آیت رؤیت کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا میں اس کے بارے میں اس امت سے بہتر جانتی ہوں۔ میں نے حضور نبی کریم ﷺ سے اس کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا میں نے جبرئیل کو دیکھا ہے

اعظم الكذب على الله.

۱۔صحیح لمسلم، کتاب الایمان، رقم:۲۸۷
۲۔صحیح البخاری، کتاب بدأ الخلق، رقم:۳۰۶۲
۳۔جامع الترمذی، کتاب التفسیر، رقم:۳۰۶۸، ۳۲۷۸
۴۔مسند احمد بن حنبل، ۶:۴۹، ۵۰
۵۔مسند ابی یعلیٰ، ۸:۳۰۴، رقم:۴۹۰۰

پھر حضرت عائشہؓ نے فرمایا جس نے یہ دعویٰ کیا کہ حضرت محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا جھوٹ باندھا ہے۔

امام طبرانیؒ المعجم الکبیر والاوسط میں حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کرتے ہیں:

عن ابن عباسؓ قال: رای محمد ﷺ ربه عزوجل مرتین مرة ببصره و مرة بفواده۔

۱۔المعجم الکبیر، ۱۲:۱۷۱، رقم:۱۲۵۶۴
۲۔المعجم الاوسط، ۶:۳۵۶، رقم:۵۷۵۷
۳۔المواهب اللدنیہ، ۲:۳۷
۴۔نشر الطیب، ۵۵

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا ایک مرتبہ سر کی آنکھوں سے اور دوسری مرتبہ دل کی آنکھوں سے۔

حضرت ابن عباسؓ کے موقف کی تائید اور اسکی تفصیل باب رویت باری تعالی میں بیان کی جائے گی۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ دونوں باتیں ایسی ہیں کہ انہیں مان لیا جائے کیونکہ سر کی آنکھیں جب تک مرتبہ جسم پر رہیں، اللہ تعالیٰ کے حسن اور اس کے نورِ ذات کو نہیں دیکھا جا سکتا اور حضور ﷺ نے جب دیکھا تو سر کی آنکھیں مرتبہ قلب پر فائز ہو چکی تھیں

اورجسم رتبے میں دل سے بدل چکا تھا یعنی کھلی ہوئی تو سر کی آنکھیں تھیں مگران کا دیکھنا ایسا تھا کہ دل دیکھ رہا ہو۔اس لئے قرآن مجید نے کہا:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی۔ دل نے جھوٹ نہ کہا جو دیکھا۔

(النجم، ۵۳:۱۱)

یہ دل وہی تو دیکھ رہا تھا جو آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔اسی طرح قلبِ حضورﷺ کومعراج حاصل ہوئی تو وہ مرتبۂ روح پر پہنچ گیا یعنی دل تو پہلے ہی اللہ رب العزت کی محویت میں غرق تھا جب وہ روح کے مرتبے تک پہنچا تو فنا ہوگیا۔پھر روح کو سرّ کا درجہ ملا تو وہ فنائے تام کے درجے تک پہنچی۔پھر سرخفی اور اَخفیٰ کے مرتبے تک پہنچا تو کبھی ''دَنٰی'' کے ذریعے مولا کو دیکھا تو کبھی ''فَتَدَلّٰی'' کے ذریعے قرب کی انتہائیں نصیب ہوئیں،آخرکار مشاہدہ اپنے کمال کو پہنچ گیا،جسے قرآن مجید میں یوں بیان کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی۔ اور (اب) انہوں نے وہ جلوہ دوسری بار دیکھا۔

(النجم، ۵۳:۱۳)

سفرِ معراج میں تاجدارِکائناتﷺ کے ہر لطیفے کو قربِ الٰہی نصیب ہوااور وہ دیدارِ الٰہی کی لذتِ دوام سے ہمکنار ہوا۔جب سب مراحل طے پا گئے تو حضورﷺ اس حال میں کرۂ ارضی کی طرف لوٹے کہ ہر ہر لطیفے میں مولا کے قرب اوراس کے دیدار کی لذتیں سما چکی تھیں۔

سفرِ معراج اپنے تین مراحل میں

۱- پہلا مرحلہ

سفرِ معراج کا پہلا مرحلہ مسجدُ الحرام سے مسجدِ اقصیٰ تک کا ہے۔ یہ زمینی سفر ہے۔ یہ چونکہ انسانی دنیا کا حصہ ہے اور ذہنِ انسانی میں اس کی تفہیم نسبتاً آسانی سے ممکن ہے اس لئے اسے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، حتیٰ کہ سفر کے اَحوال، واقعات اور اس کی حقانیت پر دلائل بھی بیان کئے گئے ہیں۔

۲- دُوسرا مرحلہ

سفرِ معراج کا دوسرا مرحلہ مسجدِ اقصیٰ سے لے کر سدرۃ المنتہیٰ تک ہے۔ یہ کرۂ ارضی سے کہکشاؤں کے اس پار واقع نورانی دنیا تک سفر ہے۔ یہ چونکہ مخلوق کی حدود کے اندر تھا لہٰذا اسے بھی بیان کیا مگر تفصیل سے بیان نہیں کیا کیونکہ یہ پوری طرح ذہنِ انسانی میں آنے والا نہ تھا۔

۳- تیسرا مرحلہ

سفرِ معراج کا تیسرا مرحلہ سدرۃ المنتہیٰ سے آگے قاب قوسین اور اس سے بھی آگے تک کا ہے۔ چونکہ یہ سفر محبت اور عظمت کا سفر تھا اور یہ ملاقات محبّ اور محبوب کی خاص ملاقات تھی لہٰذا اس روداد محبت کو راز میں رکھا گیا۔ سورۃ النجم میں فقط اتنا فرمایا کہ وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو جو راز اور پیار کی باتیں کرنا چاہیں وہ کر لیں۔ (اب کسی کو اس سے کیا غرض کہ کیا باتیں کیں) جبکہ اس مقام پر فرمایا: اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ یہ نہیں بتایا کہ دیکھنے اور سننے والا کون

ہے؟ اس سے مراد اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات بابرکات بھی ہو سکتی ہے اور آقائے دوجہاں ﷺ کی ذات بھی (یہ معنی علامہ آلوسیؒ نے بھی تفسیر روح المعانی میں بیان کیا ہے) گویا اس کے دو معانی ہو گئے:

۱- بے شک اس مقام پر فقط اللہ ہی تھا جو پیار بھرے انداز میں اپنے محبوب ﷺ کا مکھڑا تکنے والا تھا اور جو اپنے حبیب ﷺ کی میٹھی میٹھی زبان سے اس کی عرضداشت سننے والا تھا۔

۲- بے شک اس مقام پر فقط حضور ﷺ ہی تھے جو اپنے رب تعالیٰ کے حسن بے نقاب کے جلوے میں مشغول تھے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے ارشادات اور پیار بھری باتیں سننے والے تھے۔

یہ وہ مقام تھا جہاں سفرِ محبت و عظمت اپنے مقصود کو پانے والا تھا جس کا مخلوق سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا لہٰذا ان کے بتانے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ کبھی وہ سننے والا اور یہ سنانے والا تھا اور کبھی یہ دیکھنے والا اور وہ دیکھا جانے والا تھا۔

یہ معنیٰ امام صاویؒ نے بھی لیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کی حکمت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی زبانِ حکمت سے حضور ﷺ کی تعریف بیان کرنا چاہتے ہیں تاکہ واضح ہو کہ آپ کا مقام کتنا بلند ہے۔ نیز آپ ﷺ کی عظمتوں کا حال معلوم ہو سکے۔

عارف الراعی فرماتے ہیں:

و إن قابلتُ لفظة لَنْ تَرَانِیْ
بما كَذَبَ الْفُؤَادُ فهمّت معنی
فموسیٰ خرّ مغشياً علیه
و أحمد لم یکن لیزیغ ذهناً

ترجمہ:- ''اگر تو لَنْ تَرَانِیْ اور مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَیٰ کا آپس میں مقابلہ

کرے تو تیری سمجھ میں آ جائے گا کہ حقیقت کیا ہے۔ موسیٰ بے ہوش گئے جبکہ آقا ﷺ کی چشمِ اقدس بھی دنگ نہ ہوئی''۔

(الصاوی علی الجلالین، ۴: ۱۳۷)

دو کمانوں کا اِستعارہ

محبت اپنی زبان خود تخلیق کرتی ہے۔ اظہارِ محبت کسی لفظ کا بھی مرہونِ منّت نہیں ہوتا۔ چشمِ بے تاب سارا حال کہہ دیتی ہے۔ محبت کے تقاضوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تعلق اتنا گہرا ہو کہ دو کا ذکر کرنا ہو تو اس طرح کیا جائے جیسے ایک ہی کا ذکر ہے حتیٰ کہ غیریت کا تصور تک مٹ جائے۔ مثلاً قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: **ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی**، اب اس آیت میں دو افعال ہیں مگر کسی ایک کے فاعل کا بھی ذکر نہیں کیا گیا۔ اب اس میں مختلف صورتیں ممکن ہیں:

۱- دونوں کا فاعل اللہ ہو: اگر دونوں کا فاعل اللہ ہو تو مفہوم یہ ہو گا ''پھر اللہ قریب ہوا، پھر اللہ مزید قریب ہوا''۔

۲- دونوں کا فاعل حضور ﷺ کو بنایا جائے: اس صورت میں معنیٰ یہ ہو گا ''پھر حضور ﷺ قریب ہوئے، پھر حضور ﷺ مزید قریب ہوئے''۔

۳- **دَنٰی** کا فاعل حضور ﷺ کو اور **تَدَلّٰی** کا فاعل اللہ رب العزت کو بنایا جائے:

یہ معنی زیادہ قرین قیاس ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلا قرب تو آنے والا خود ہی چاہتا ہے مگر مخلوق کو محدود ہونے کے سبب سے کسی نہ کسی حد پر رک ہی جانا تھا۔ سو باقی رہنے والے فاصلے کو مٹانے کے لئے اور قرب کی حدوں کو توڑ دینے کے لئے اللہ آگے بڑھا کہ جو غیر محدود ہے۔

اس کی تائید امام شعرانیؒ کی بیان کردہ اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ جب

حضورﷺ آگے پہنچے تو ربِ کائنات نے ارشاد فرمایا:

قف يا محمد! إن ربک يصلی۔	ٹھہر جاؤ اے محمدﷺ! بیشک تمہارا رب قریب ہوتا ہے۔

(الیواقیت والجواہر، ۲:۳۵)

صَلّٰی، یُصَلِّیْ کا معنی قریب ہونا صاحبِ ''**الصَّلٰوۃ و البُشر**'' نے بھی لیا ہے۔

اب رہی بات یہ کہ اللہ کس قدر قریب ہوا تو اس کا جواب اس آیت کریمہ سے بخوبی ملتا ہے۔ فرمایا:

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى۔ (النجم، ۵۳:۸)	پھر دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا یا اس سے بھی کم رہ گیا (جس کی کوئی حد معلوم نہیں)۔

ایک لطیف نکتے کی وضاحت

دوئی کے مٹانے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ توحید و رسالت کا تعلق ایسا ہے کہ دو کو مانا جائے مگر دونوں میں ایسی دُوئی جو غیریت کا مفہوم رکھتی ہو اُسے تسلیم نہ کیا جائے۔ گویا جس طرح دو ہونے کا انکار کرنا کفر ہے اس کی طرح دُوئی کو بدرجۂ غیریت ماننا بھی کفر ہے۔

تمثیل کا ثقافتی پس منظر

جزیرہ نمائے عرب میں ظہورِ اسلام کے وقت اگرچہ کوئی مرکزی حکومت نہ تھی۔ سیاسی اور جغرافیائی وحدت کا تصور عملاً مفقود تھا، تاہم قبائلی رسم و رواج کی پابندی کی جاتی۔ عربوں کا ایک اپنا مزاج تھا جس نے ان کی ثقافتی اِکائی کو بڑی حد تک زمانے

کی دستبرد سے محفوظ رکھا۔

عربوں کا ایک طریقہ تھا کہ جب دو قبیلے آپس میں ملتے اور معاہدہ کر کے یک جان دو قالب ہونا چاہتے تو فریقین اپنی کمانوں کو آپس میں بدلتے اور پھر ملا کر تیر پھینکتے تو یہ تصور کیا جاتا کہ ایک کا پھینکا ہوا تیر دوسرے کا ہے اور دوسرے کا پھینکا ہوا تیر پہلے کا ہے۔ ایک فریق کی دوستی دوسرے فریق کی دوستی ہے اور ایک کی دشمنی دوسرے کی دشمنی ہے۔ گویا قاب قوسین کی مثال دے کر اللہ رب العزت یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں جس نے اللہ سے تعلق جوڑنے کا ارادہ رکھا اسے چاہئے کہ اس کے محبوب ﷺ کے دامنِ رحمت سے لپٹ جائے اور جس کسی نے اس کے محبوب ﷺ سے (معاذ اللہ) بغض رکھا، آپ ﷺ کی شان میں (نعوذ باللہ) تنقیص کی جسارت کی، اللہ نے اس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

معراج بلاشبہ حضور ﷺ کا زندہ معجزہ ہے۔ یہ معجزہ براہِ راست اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ حضور ﷺ کی عظمت، رفعت اور حقیقت کسی بھی فردِ بشر کی سمجھ بوجھ، عقل و خرد اور فہم و فراست کی پرواز سے بلند اور بہت ہی بلند ہے حتیٰ کہ کسی کے لئے اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔

مراحلِ سفرِ معراج

حقیقتِ معراج کے چند گوشے بیان کرنے کے بعد اب ہم مختلف احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں واقعہ معراج کی جملہ تفصیلات بیان کرتے ہیں۔

مرحلۂ اُولیٰ ...... بیتُ اللہ سے بیتُ المقدس تک

سفرِ معراج، سفرِ محبت بھی ہے اور سفرِ عظمت بھی۔ بیتُ اللہ سے بیت المقدس

اس سفرِ مقدس کا پہلا مرحلہ تھا۔ یہ واقعہ متعدد صحابہ کرامؓ سے مروی ہے اور متعدد طرق، اسناد اور تفصیلات کے ساتھ منقول ہے۔ نیز تابعین نے بھی اسے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

حضور رحمتِ عالم ﷺ حطیمِ کعبہ میں آرام فرما رہے تھے کہ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نے آ کر تاجدارِ کون و مکاں ﷺ کو جگایا۔ آپ ﷺ نیند سے بیدار ہوئے، اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر لیٹ گئے۔ جبرئیل امین علیہ السلام نے دوبارہ حضور ﷺ کو بیدار کیا۔ آپ ﷺ نے پھر اِدھر اُدھر دیکھا اور لیٹ گئے۔ پھر جبرئیل امین علیہ السلام نے تیسری مرتبہ درِ اقدس پر آواز دی۔ اس مرتبہ حضور ﷺ اٹھے تو جبرئیل علیہ السلام نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! اللہ رب العزت نے آپ کو اپنی ملاقات کے لئے بلایا ہے۔ اس وقت حضور ﷺ کا سینۂ اقدس حلق سے لے کر ناف تک چاک کیا گیا اور قلبِ اطہر کو نکالا گیا۔ اللہ رب العزت نے ملاءِ اعلیٰ سے ایک طشت کے اندر اپنے خصوصی اَنوار و تجلیاتِ حکمت بھیجے تھے۔ ان اَنوار و تجلیات سے حضور ﷺ کے قلبِ اقدس کو دھویا گیا تاکہ حضور ﷺ کا قلبِ اطہر سفرِ معراج شروع کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ذاتی انوار و تجلیات کے فیض کو کماحقہ اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت پیدا کر لے۔ پھر حضور ﷺ کی بارگاہ میں ایک سواری پیش کی گئی جو قد کے اعتبار سے گوش دراز سے اونچی اور خچر سے نیچی تھی۔ اس کا رنگ چمکدار اور سفید تھا۔ اس کا نام ''براق'' تھا۔

عن مالک بن صعصعة، قال: قال رسول اللہ ﷺ "بينا أنا فی الحجر......و فی رواية فی الحطيم......بين النائم و	حضرت مالک بن صعصعہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں حجر......دوسری روایت میں حطیم کا ذکر ہے...... میں نیند اور بیداری کی

اليقظان، إذ أتانی آت، فشقّ ما بين هذه إلى هذه، فاستخرج قلبی، فغسله ثم أعيده، ثم أتيت بدابة دون البغل فوق الحمار أبيض، يقال له ''البُرَّاق'' فحملت عليه''۔	درمیانی کیفیت میں تھا جب میرے پاس آنے والا (فرشتہ) آیا۔اس نے (میرا سینہ) یہاں سے یہاں تک چیرا۔پھر میرے دل کو نکال کر غسل دیا۔ پھر دوبارہ اندر رکھ دیا۔پھر ایک سواری لائی گئی جو خچر سے چھوٹی اور گوش دراز سے بڑی تھی۔ اس کا رنگ سفید تھا۔ اسے ''براق'' کہا جاتا ہے پس مجھے اس پر سوار کرایا گیا۔
(روح المعانی،۱۵:۵)	

جب تاجدارِ کائنات ﷺ کو براق پر سوار کیا گیا تو وہ فخر و انبساط سے ناچنے لگی کہ آج اسے سیاحِ لامکاں ﷺ کی سواری ہونے کا لازوال اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔ براق اس سعادتِ عظمیٰ پر وجد میں آ گیا۔اس پر جبرئیلِ امین علیہ السلام نے اس سواری سے فرمایا:

''رک جا! اللہ کی عزت کی قسم تجھ پر جو سوار بیٹھا ہے آج تک تجھ پر ایسا سوار نہیں بیٹھا''۔

حضور رحمتِ عالم ﷺ کو براق پر سوار کرا کے انہیں بیت المقدس کی طرف لے جایا گیا۔ براق کی رفتار کا یہ عالم تھا کہ جہاں سوار کی نظر پڑتی تھی وہاں اس کا قدم پڑتا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قبرِ انور میں نماز ادا کرنا

سفرِ معراج کے پہلے مرحلے پر سفر جاری تھا کہ حضور رحمت عالم ﷺ کا گزر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبرِ انور کے قریب سے ہوا۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ وہ اپنی قبرِ انور میں کھڑے صلوٰۃ پڑھ رہے تھے۔

انبیاء صف بہ صف آپ ﷺ کے استقبال کیلئے کھڑے تھے

جب یہ مقدس قافلہ بیت المقدس پہنچا تو بابِ محمد آپ ﷺ کے استقبال کے لئے کھلا تھا۔ جبرئیل امین علیہ السلام نے اپنی انگلی سے دروازے کے قریب موجود ایک پتھر میں سوراخ کیا اور براق کو اس سے باندھ دیا۔ پھر آپ ﷺ بیت المقدس میں داخل ہوئے تو تمام انبیائے کرام علیھم السلام آپ ﷺ کی تعظیم، اِکرام اور اِحترام میں منتظر تھے۔ انہیں حضور ﷺ کی امامت میں نماز پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔

مرحلۂ ثانیہ...... بیت المقدس سے سدرۃ المنتہیٰ تک

انبیاء حضور ﷺ کی اقتداء میں نماز ادا کر کے ادب و احترامِ مصطفیٰ ﷺ سے مشرف ہو چکے تو آسمانی سفر کا آغاز ہوا، اس لئے کہ ہر زمینی عظمت حضور ﷺ کے قدموں کا بوسہ لے چکی تھی۔ پہلے آسمان پر پہنچ کر آسمان کے دروازے پر دستک دی گئی۔ بوّاب پہلے سے منتظر تھا۔ آواز آئی: کون ہے؟ ...... جبرئیل امین نے جواب دیا: میں جبرئیل ہوں۔ ...... آواز آئی: آپ کے ساتھ کون ہے؟ ...... جواب دیا: یہ محمد ﷺ ہیں۔ آج کی رات انہیں آسمانوں پر پذیرائی بخشی جائے گی۔ آسمان کا دروازہ کھل گیا اور پوچھنے والے نے حضور ﷺ کی بارگاہِ بیکس پناہ میں سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل کی۔ **مرحبا یا سیدی یا مرشدی مرحبا**

فانطلق بی، حتی أتی السماء الدنیا فاستفتح، قیل: من ھذا؟	پھر آپ ﷺ آسمانوں کی طرف بڑھے اور جب آسمانِ دنیا پر آئے تو

قال: جبرئيل، و من معك؟ قال: محمد، قيل: قد أرسل إليه؟ قال: نعم، قيل: مرحبا به فنعم المجيئ جاء۔

(تفسیر البغوی، ۳:۹۳)

دروازہ کھٹکھٹایا۔ آواز آئی: کون؟ جبرئیل امین نے کہا: جبرئیل۔ پھر کہا گیا: آپ کے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا: محمد ﷺ۔ پھر پوچھا گیا: کیا انہیں بلایا گیا ہے؟ جبرئیل نے کہا: ہاں۔ آواز آئی: خوش آمدید، کتنا اچھا آنے والا آیا ہے۔

تاجدارِ کائنات حضور رحمتِ عالم ﷺ کی ملاقات حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ آپ کے جلیل القدر فرزند ہیں۔ ختم المرسلین ہیں۔ یہی حضرت محمد ﷺ ہیں۔ یہی کل انبیاء کے سرتاج ہیں۔ آقائے دوجہاں ﷺ نے دادا جان کہہ کر آدم علیہ السلام کی بارگاہ میں سلام ارشاد فرمایا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے سلام کا جواب بھی عرض کیا اور اپنے عظیم فرزند کو دعاؤں سے بھی نوازا۔ اس کے بعد مہمانِ عرش حضور پُرنور ﷺ کو دوسرے آسمان کی طرف اٹھایا گیا۔ پہلے آسمان کی طرح بوّاب نے دوسرے آسمان کا بھی دروازہ کھولا۔ یہاں حضور ﷺ کی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ اس یادگار ملاقات اور آسمان کے ملکوتی مشاہدات کے بعد آپ ﷺ کو تیسرے آسمان کی طرف اٹھایا گیا۔ تیسرے آسمان پر حضور ﷺ کی ملاقات سیدنا یوسف علیہ السلام سے کرائی گئی۔ تیسرے آسمان کے مشاہداتِ نورانی کے بعد حضور ﷺ کو چوتھے آسمان پر پہنچایا گیا۔ چوتھے آسمان پر تاجدارِ کائنات ﷺ کی ملاقات حضرت ہارون علیہ السلام سے کرائی گئی۔ اسی طرح حضور ﷺ سفرِ معراج طے کرتے ہوئے چھٹے آسمان پر پہنچے اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی چشمانِ

مقدس اشکبار ہوگئیں۔ حضور ﷺ کی عظمت و رفعت کو دیکھ کر رشک کے آنسو چھلک پڑے۔ آپ کی زبانِ اقدس سے بے اختیار نکلا کہ خدائے بزرگ و برتر کے یہ وہ برگزیدہ رسول ہیں جن کی امت کو میری امت پر شرف عطا کیا گیا۔ میری امت پر جسے بزرگی عطا ہوئی یہ وہی رسولِ برحق ہیں جن کی امت کو میری امت کے مقابلے میں کثرت کے ساتھ جنت میں داخل کیا گیا۔ مہمانِ ذی حشم حضور رحمتِ عالم ﷺ کی ملاقات ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوئی۔

دیدارِ مصطفیٰ ﷺ کے لئے ملائکہ کے ہجوم در ہجوم

مشاہداتِ آسمانی کے نورانی جلوؤں کے بعد تاجدارِ کائنات ﷺ کو سدرۃ المنتہیٰ کے مقام تک لے جایا گیا۔ یہ وہ مقامِ عظیم ہے جہاں آ کر ملائکہ، حتیٰ کہ انبیاء و رُسل کی بھی پرواز ختم ہو جاتی ہے۔ جہاں مقرب فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ گویا ملاقات کا سارا نظام اور عالمِ امکان کی ساری بلندیاں سدرۃ المنتہیٰ پر ختم ہو جاتی ہیں۔ سدرۃ المنتہیٰ کا مقام اولیٰ عالمِ مکان کی آخری حد اور لامکاں کا ابتدائی کنارہ ہے۔ اس مقام پر تفسیر نیشاپوری اور تفسیر دُرِ منثور میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے۔ فرشتے اللہ رب العزت کی بارگاہِ اقدس میں دعا مانگتے تھے کہ اے کائنات کے مالک! جس محبوب ﷺ کی خاطر تو نے یہ کائنات تخلیق فرمائی جس پر تو اپنی زبانِ قدرت سے ہمہ وقت درود پڑھتا ہے اور ہم بھی تیرے حکم کی تعمیل میں اس ہستی پر درود و سلام کا نذرانہ بھیجتے ہیں آج وہی مہمانِ ذی وقار تشریف لا رہے ہیں۔ اے باری تعالیٰ! ہمیں اپنے اس رسولِ محتشم ﷺ کا بے نقاب جلوہ عطا فرما۔ اللہ پاک نے ان مقرب ملائکہ کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور فرمایا کہ تم ساری کائناتِ آسمانی سے سمٹ کر اس درخت ''سدرۃ المنتہیٰ'' پر بیٹھ جاؤ۔ فرشتے ہجوم در ہجوم اُمڈ پڑے۔ فرشتوں کی اتنی کثرت ہوئی کہ وہ درخت ان کے

نور کے سائے میں آ گیا:

إستأذنتِ الملائکةُ الربَّ تبارک و تعالٰی أن ینظروا إلی النبی ﷺ، فأذن لهم، فغشیت الملائکةُ السِّدرةَ لینظروا إلٰی النبی ﷺ۔

(الدرالمنثور، ۶:۱۱۶)

فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے حضور ﷺ کی زیارت کی خواہش کا اظہار کیا تو انہیں اجازت دے دی گئی۔ پس فرشتوں نے سدرہ (بیری کے درخت) کو اپنی کثرت سے چھپا لیا تا کہ نبیٔ اکرم ﷺ کی زیارت کر سکیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

إِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی o

(النجم، ۵۳:۱۶)

جب سائے میں لے کر چھپالیا سدرہ کو جس نے کہ چھپا لیا (ملائکہ کی کثرت نے)o

سدرۃ المنتہٰی کے مقامِ عظیم پر قدسیانِ فلک کو مہمانِ ذی وقار کے دیدارِ فرحت آثار کا لازوال شرف حاصل ہوا۔

رخِ مصطفٰی ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری بزمِ خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

جب مہمانِ عرش آگے بڑھنے لگے تو جبرئیلِ امین رک گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: جبرئیل چلو! تو عرض کیا:

لو دنوتُ أنملةً لاحترقتُ۔

(الیواقیت والجواہر، ۲:۳۴)

اگر میں ایک چیونٹی بھر ابر بھی آگے بڑھا تو (تجلیاتِ الٰہی کے پرتو سے) جل جاؤں گا۔

سدرہ سے آگے یکتا وتنہا

اس مقام پر آقا ﷺ کو جنت کی سیر کرائی گئی۔ حضور رحمتِ عالم ﷺ نے جنت کے احوال کا مشاہدہ فرمایا اور وہاں کی نعمتوں کی زیارت فرمائی۔ حضور ﷺ جب سفرِ معراج کی اگلی منزل کی طرف روانہ ہوئے تو جبرئیل اور براق ساتھ نہ تھے۔ آپ یکتا وتنہا ہی اپنے خالقِ کائنات کے اذن سے روانہ ہوئے۔ اللہ رب العزت نے اپنے مہمانِ عرش کی سواری کے لئے ایک سبز رنگ کا ملکوتی اور نورانی تخت بھیج دیا۔ اس تخت کا نام ''زخرف'' تھا۔ حضور رحمتِ عالم ﷺ کو عرشِ معلیٰ تک پہنچایا گیا۔ جب سدرۃ المنتہیٰ کی منزل گزر چکی، جب فرشتوں کا استقبال پیچھے رہ گیا تو آگے ایک نور تھا اور دیکھنے والے کو اس نور کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ جب حضور ﷺ کو اس نور میں غائب کر دیا گیا تو دیکھنے والی آنکھ آپ کو دیکھنے سے قاصر تھی۔ اب کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ نور کیا ہے؟ کیسا ہے؟ کہاں سے ہے؟ کہاں تک ہے؟ کہاں جانے والا ہے؟ اس حصارِ نور میں داخل ہونے کے بعد مہمانِ ذی حشم حضور رحمتِ عالم ﷺ نے عرشِ معلیٰ کی سیر کی۔ اس کے بعد مہمانِ مکرم کو بڑی عزت، وقار اور تمکنت کے ساتھ آگے لے جایا گیا۔

مرحلۂ ثالثہ......سدرۃ المنتہیٰ سے وصالِ الٰہی تک

سدرۃ المنتہیٰ سے وصالِ الٰہی تک سفرِ معراج کا نقطہ عروج ہے۔ یہاں سے سفر کا ایک نیا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ آگے ایک عالم نور تھا۔ انوار وتجلیاتِ الٰہی پُر فشاں تھے۔ اللہ رب العزت کی ذاتی اور صفاتی تجلیات سے بھرپور عالمِ لامکاں کے جلوے ہر سو جلوہ ریز تھے۔ مہمانِ عرش حضور رحمتِ عالم ﷺ کو تن تنہا ان جلوؤں میں داخل کر دیا گیا۔ سب سے پہلے اللہ پاک کے اسماء کے پردے ایک ایک کر کے گزرتے رہے اور

ہر اسم مبارک کے رنگ سے حضور ﷺ کو گزارا گیا۔ حضور ﷺ عالمِ بیداری میں تھے لہٰذا اس عجیب سی کیفیت کو دیکھ کر بتقاضائے بشریت کچھ معمولی سی وحشت بھی محسوس فرمانے لگے جیسا کہ انسان اکثر لمحاتِ تنہائی میں محسوس کرتا ہے۔ جونہی حضور پُر نور ﷺ کے قلبِ اقدس پر یہ کیفیت وارد ہوئی اللہ رب العزت کی طرف سے آواز آئی:

قف یا محمد ﷺ! **إن ربک یصلی۔**	پیارے محمد ﷺ رک جاؤ! بے شک تمہارا رب (استقبال کے لئے) قریب آ رہا ہے۔
(الیواقیت والجواہر، ۲:۳۵)	

سفرِ وصال

معجزۂ معراج میں یہاں تک کا سفر، سفرِ محبت وعظمت تھا۔ اب یہاں سے آگے سفرِ وصال شروع ہوتا ہے۔ سفرِ معراج کے اس مرحلہ پر مہمانِ عرش حضور رحمتِ عالم ﷺ مقامِ ''**قاب قوسین**'' پر پہنچ گئے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی o فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ أَوْ أَدْنٰی o	پھر (اس محبوبِ حقیقی سے) آپ قریب ہوئے اور آگے بڑھے o پھر (یہاں تک بڑھے کہ) صرف دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔
(النجم، ۵۳:۸)	

یہاں توجہ طلب بات یہ ہے کہ دو قوسوں پر بات ختم نہیں کی بلکہ قُرب اور بُعد کے تمام جھگڑے ختم کرنے کے لئے تمام حدوں کو توڑ دیا، تمام فاصلے مٹا دیئے، تمام

فاصلے یکسر ختم کر دیئے، سوائے ایک فرق کے کہ وہ خدا تھا...... خدائے لاشریک اور یہ اس کے محبوب بندے اور رسول تھے۔ وہ خالق تھا اور یہ مخلوق۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

فَأَوْحٰی إِلٰی عَبْدِهٖ مَا أَوْحٰی o پس وحی کی اپنے بندے کی طرف جو کہ اس نے وحی کی o

(النجم،۵۳:۱۰)

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ محبّ اور محبوب کے درمیان تنہائی کی ملاقات میں جو باتیں ہوئیں ان کا بیان بھی نہیں فرمایا لہٰذا محبّ اور محبوب میں کیا کیا باتیں ہوئیں، اس کلام کی حقیقتوں کی کسی کو کچھ خبر نہیں۔ حضور رحمتِ عالم ﷺ نے فقط اتنا بیان فرمایا کہ جب ملاقات ہوئی تو خالقِ کائنات نے فرمایا:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ أَیُّهَا النَّبِیُّ وَ رَحْمَةُ اللهِ وَ بَرَکَاتُهٗ۔ اے نبی! تمہارے اوپر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت ہو اور اس کی برکتیں ہوں۔

(معارج النبوۃ،۳:۱۴۹)

حضور پُر نور ﷺ نے رحمت کے اس پیغام کے جواب میں عرض کیا:

اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَ عَلٰی عِبَادِ اللهِ الصَّالِحِیْنَ۔ سلام ہم پر اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر۔

(معارج النبوۃ،۳:۱۴۹)

اور پھر واپسی پر حضور ﷺ کو اُمت کے لئے پچاس نمازوں کا تحفہ عطا کیا گیا جسے لے کر آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی ذاتی و صفاتی تجلیات اور تمام فیوض و برکات سمیت واپس کرۂ ارضی کی طرف پلٹے۔

سفرِ معراج سے کرۂ ارض کی طرف واپسی

سفرِ معراج محبت وعظمت کا سفر تھا۔ اس سفر سے اہلِ ارض کی طرف واپسی بھی محبت اور عظمت کی مظہر تھی۔ بعض کتبِ تفاسیر میں اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ واپسی پر بھی حضور پُر نور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں برّاق پیش کیا گیا۔ اس کے ذریعہ آپ ﷺ واپس مکہ مکرمہ تشریف لائے۔ جیسے جاتے ہوئے ہر آسمان پر ایک برگزیدہ نبی اور ملائکہ کے ساتھ ملاقات کا مفصل ذکر ہے ایسے ہی واپسی پر تفصیلی ملاقاتوں کا ذکر موجود نہیں لہٰذا واپسی کی تفصیلات اور جزئیات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو ہی معلوم ہیں۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں معجزۂ معراج کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ واپسی کے دوران چھٹے آسمان پر جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے حضور ﷺ کی ملاقات ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! اللہ رب العزت کی بارگاہ سے اپنی امت کے لئے کیا تحفہ لائے ہیں۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ نے میری امت کے لئے پچاس نمازیں یومیہ عطا کی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ میں نے اپنی امت پر بہت محنت و مشقت کی تھی جس سے حاصل ہونے والے تجربے کے نتیجے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا۔ آپ ﷺ واپس تشریف لے جایئے اور اللہ کی بارگاہ میں نمازوں میں تخفیف کی درخواست کیجئے۔ یارسول اللہ ﷺ! آپ کی امت پچاس نمازوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکے گی۔

حضور ﷺ نے اس مشورے پر عمل کیا اور وہاں سے پلٹے اور ربِ کائنات کے دربارِ گہر بار میں حاضر ہوئے اور امت کے لئے پچاس نمازوں میں کمی کی اِستدعا کی۔ اس طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیثِ مبارکہ کے مطابق اس مرتبہ پانچ نمازیں کم ہوئیں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا

یارسول اللہ ﷺ! یہ بوجھ بھی زیادہ ہے۔ حضور ﷺ پھر بارگاہِ ایزدی میں ملتجی ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے مزید پانچ نمازوں کی کمی فرمادی۔ یہ سلسلہ چلتا رہا اور حضور ﷺ نو بار اللہ رب العزت کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور صرف پانچ نمازیں باقی رہ گئیں۔ صحیح بخاری میں مروی حدیثِ مبارکہ کے مطابق چار مرتبہ دس دس نمازوں کی اور پانچویں مرتبہ پانچ نمازوں کی کمی ہوئی۔ غرض جب پانچ نمازیں رہ گئیں تو موسیٰ علیہ السلام نے حضور ﷺ سے پھر گزارش کی کہ آپ کی امت یہ پانچ نمازیں بھی پوری طرح ادا نہیں کر سکے گی لہٰذا ایک بار پھر بارگاہِ خداوندی میں التماس گزاریں۔ اس پر تاجدارِ کائنات ﷺ نے فرمایا: اب کی بار مجھے جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ (حدیث کے اَلفاظ اشارہ کر رہے ہیں کہ اللہ کی طرف سے اپنے محبوب رسول ﷺ کی بات ٹالنے کا تصور ہی نہیں یعنی اگر ایک مرتبہ پھر حاضری ہو جاتی تو مزید کمی بھی ہو سکتی تھی مگر حضور ﷺ خود ہی حاضر نہ ہوئے) پھر جب حضور ﷺ وہاں سے چلے تو اوپر سے آواز آئی کہ اے محبوب! نمازیں تو میں نے پانچ کر دی ہیں لیکن ان پانچ نمازوں کے ادا کرنے پر ثواب تیری امت کو پچاس نمازوں کے برابر ہی ہوگا۔

خودساختہ عقائد کی مَن مانی تأویلات

روشنی کے سفر کی اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ حروفِ حق کے اجلے پن پر گروہی اور مسلکی مفادات کی سیاہی اس حد تک مل دی جائے کہ خورشیدِ جہاں تاب کی کرنوں پر جہالت کے اندھیرے مسلط ہو جائیں اور صبحِ نو کے اُجالے پس منظر میں چلے جائیں۔ دین کو مختلف خانوں میں بانٹ کر ہم نے خودساختہ عقائد کی مَن مانی تاویلات کا ''کارنامہ'' تو سرانجام دے لیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اتحادِ امت کو پارا پارا کر کے عالمِ کفر کے مقابلے میں دین کی قوتوں کو سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور بھی کر دیا

ہے۔ یہ بات انتہائی افسوسناک ہے کہ اکثر دینی معاملات کو مناظرانہ اور مجادلانہ نزاع کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ اعتقادی اور مسلکی اختلافات اتنے شدید ہو چکے ہیں کہ تنقید، اختلاف اور نزاع کے سوا دین کے کسی مسئلہ کو دیکھنا اور سمجھنا گوارا ہی نہیں کیا جاتا اور پھر اس سے بڑھ کر بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ اکثر اختلافات کا مرکز و محور (نعوذ باللہ من ذالک) حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس کو بنالیا گیا ہے۔

انگریز نے نوآبادیاتی دور کی سب سے کاری ضرب کے طور پر برصغیر میں مسلمانوں کی متاعِ حیات چھیننے کی جو سازش کی تھی اور حضور ﷺ کی ذات کو مباحث کا موضوع بنا کر عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی آگ کو سینے میں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کرنے کا جو فتنہ برپا کیا تھا وہ آج امربیل کی طرح ایمان کی شاخوں پر براجمان ہے۔ نت نئے فتنوں کے ساتھ کبھی حضور ﷺ کے اختیارات و تصرفات موضوعِ مناظرہ ہیں تو کبھی آپ ﷺ کی شخصیتِ مبارکہ یا علمِ مبارک، کبھی آپ کی روحانیت اور اس کے فیض کا کائنات میں ہمہ وقت جاری و ساری رہنا موضوع بحث ہے تو کبھی بشریت اور نورانیت۔

حضور ﷺ کے فضائل و کمالات کے باب میں جب بھی کوئی آیت، حدیث یا کوئی واقعہ ہمارے سامنے آتا ہے تو اسی زاویئے سے اس امر کا جائزہ لیا جاتا ہے اور اپنے خودساختہ موقف کی تائید میں الٹی سیدھی تاویلیں گھڑی جاتی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اپنے مذمومہ تصورات کو مسلک اور عقیدے کا نام دے کر ذہنوں میں جما لیا جاتا ہے اور پھر جو کوئی آیت یا حدیث سامنے آتی ہے اسے خاص مسلکی تعصّبات سے رنگیشیشوں والی عینک سے دیکھتے ہیں۔ اب جو شخص سرخ شیشے والی عینک لگا کر سفید شئے کو دیکھے گا تو ظاہر ہے کہ اسے سفید چیز سرخ ہی نظر آئے گی۔ ان جھگڑوں کو ختم کرنے

کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ اپنی ان آنکھوں پر ایک ہی رنگ کی عینک لگا لی جائے اور وہ رنگ صرف قرآن وسنت کا رنگ ہو۔ اگر ایسا ہو جائے تو اختلافات نہ ہونے کے برابر رہ جائیں گے۔

بار بار لوٹ کر جانا نبوت کا کمال تھا

اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے خلاف عہدِ رسالتمآب ﷺ میں یہود ونصاریٰ کی طرف سے فتنہ وشر کی آگ بھڑکائی گئی تھی۔ آج اکیسویں صدی عیسوی کے آغاز پر بھی اس کی شدت میں کمی نہیں آسکی۔ کیا ہم ان اسلام دشمن طاقتوں کا آلۂ کار بن کر اسلام کے نادان دوستوں کا کردار نہیں ادا کر رہے! واقعہ معراج میں بھی بہت سے معاملات کو اسی طرح لیا گیا ہے۔ اپنا مخصوص نقطۂ نظر حق ثابت کرنے کے لئے خدا جانے کیا کیا تاویلات پیش کی گئی ہیں۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی واقعہ کا اصل مدعا کچھ اور ہوتا ہے جبکہ دین کا پرچار کرنے والے اپنے مطلب کی بات نکال کر اصل روح کو مسخ کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کو امتِ محمدیہ کے لئے پچاس نمازیں عطا کیں۔ پھر تقریباً ۹ مرتبہ آنے جانے سے صرف پانچ رہ گئیں، پہلے پچاس کیوں دیں؟ اور راستے میں موسیٰ علیہ السلام کو کھڑا کر کے محبوب ﷺ کو بار بار کیوں بلوایا؟ اور آخر میں پانچ نمازیں کیوں رہ گئیں؟ اس کی حکمت تو نمازیں دینے والا جانتا ہے یا پھر نمازیں لینے والا؟ اللہ اور رسول نے اس کی وجہ بیان نہیں فرمائی۔ بہتر ہے اس پر خاموشی اختیار کی جائے لیکن ہم وجہ تلاش کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اپنے اپنے مطلب کے دلائل ثابت کرنے کے لئے استدلال کے انبار لگا رہے ہیں۔ حضور ﷺ کا بار بار لوٹ کر جانا آپ ﷺ کی نبوت کا کمال تھا اور ہے لیکن افسوسناک بلکہ شرمناک بات یہ ہے کہ اس میں بھی تنقیص کا پہلو نکالا گیا اور

یہاں تک کہنے کی جسارت کی گئی کہ اگر حضور ﷺ کو علم ہوتا کہ بالآخر پانچ نمازیں ہی رہ جانی ہیں تو شروع سے ہی پانچ لے آتے، پچاس کیوں لیں؟ اور ۹ چکر کیوں لگائے؟ یہ ایک متعصّبانہ رنگ کی عینک ہے۔ جب اس رنگ کی عینک سے اس حدیث پاک کو دیکھا جائے تو یہی کچھ نظر آتا ہے۔ کاش! اس واقعہ سے حضور ﷺ کے کمال ہی کے رخ کو دیکھا جاتا۔ چونکہ یہ سوال اپنی جگہ ہرگز ہرگز علمی نہیں لہٰذا اس کا سادہ سا جواب یوں ہے کہ چلو بفرضِ محال حضور ﷺ کو تو علم نہ تھا، اللہ کو تو معلوم تھا لہٰذا خود ہی پہلی دفعہ پانچ دے دیتا۔ گویا ہوش و خرد سے خالی سوال کرنے والے اور علمِ مصطفیٰ ﷺ پر اعتراض کی جسارت کرنے والے نے فقط شانِ حضور ﷺ ہی میں تنقیص کا پہلو تلاش کرنے کی جسارت نہ کی بلکہ شانِ الوہیت پر بھی اعتراض کے دروازے کھول دیئے۔ (یاد رہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا تعلق ایسا ہے کہ جو اعتراض رسول ﷺ پر کیا جائے گا وہی اعتراض کسی نہ کسی صورت میں اللہ پر بھی وارد ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ادب اللہ تبارک و تعالیٰ کے ادب سے جدا نہیں) اصل بات یہ ہے کہ پہلے پچاس نمازیں دیں تو وہ بھی اللہ رب العزت کا امر تھا پھر کم ہوئیں، حتیٰ کہ پانچ تک آ گئیں تو یہ بھی اللہ رب العزت کا امر تھا۔ رہا بار بار کا آنا جانا...... تو یقینی بات ہے کہ اس میں اللہ رب العزت کی طرف کوئی حکمت ہوگی۔

اپنائیت اور محبت کے پیمانے

حضور رحمتِ عالم ﷺ کے بار بار آنے جانے کو اگر محبت اور اپنائیت کے پیمانے پر رکھا جائے تو اور ہی حکمتیں ذہن میں آتی ہیں۔ ان حکمتوں سے محبتِ رسول کی خوشبو کے جھونکے آتے ہیں۔ عشقِ مصطفیٰ ﷺ کے چراغ جلتے دکھائی دیتے ہیں۔ عرفاء نے اس کی بہت سی حکمتیں بیان کی ہیں۔

قرآنِ مجید میں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی جب مصر گئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے حضرت بنیامین علیہ السلام کو پہچان لیا۔ بھائی کی محبت غالب آئی تو انہوں نے چاہا کہ بنیامین کو کسی طرح روک لیا جائے اور دوسرے بھائیوں پر ظاہر بھی نہ ہو کہ میں وہی یوسف ہوں جسے وہ خود کنویں میں پھینک آئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بنیامین کے سامان میں اپنی کوئی چیز چھپا دی اور جب وہ سب روانہ ہونے لگے تو فرمایا کہ ہمارا کچھ سامان کھو گیا ہے، جس کے پاس سے برآمد ہوگا اسے ہم گرفتار کر لیں گے۔ ذرا ان مسافروں کی تلاشی تو لو۔ جب بنیامین کے تھیلے سے سامان نکلا تو فرمانے لگے ہم اسے نہیں جانے دیں گے۔ چونکہ یوسف علیہ السلام کو اپنے بھائی سے بچھڑے ہوئے کئی سال ہو گئے تھے لہٰذا ان کی محبت کا تقاضا تھا کہ بھائی کو کسی طرح روک لیا جائے۔ بلاتشبیہہ و بلا مثال کچھ ایسا ہی معاملہ ادھر بھی ہے کہ کسی ایسے بہانے کی ضرورت تھی جس کے پیشِ نظر محبوب ﷺ بار بار پلٹ کر بارگاہِ الوہیت میں حاضری دیتا رہے اور محبّ کی نگاہیں اس کے چہرے کو بار بار تکتی رہیں۔ سو جب دیکھا کہ میرے محبوب کو اپنی امت سے شدید محبت ہے تو امت کے بوجھ کو بہانا بنایا اور نمازیں از خود زیادہ دے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو راستے میں کھڑا کر دیا۔

اہلِ محبت نے اس کی تعبیر ایک اور طرح سے بھی کی ہے یعنی اس بار بار آنے جانے کا مقصد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک دعا ہے جو انہوں نے طور پر مانگی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا تھا۔

رَبِّ اَرِنِیْ۔ مولا! مجھے اپنے جلوۂ حسن عطا کر۔

(الاعراف، ۷:۱۴۳)

بارگاہِ صمدیت سے جواب ملا تھا:

لَنْ تَرَانِیْ۔ (اے موسیٰ!) تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔ (الاعراف، ۷:۱۴۳)

بعض عرفاء نے بیان کیا ہے کہ عشق و محبت میں مچل کر موسیٰ علیہ السلام نے بار بار سوال کیا تھا۔ کسی نے کہا پانچ مرتبہ سوال کیا تھا، کسی کے مطابق ۹ مرتبہ بارگاہِ خداوندی میں التماس گزاری تھی اور قاعدہ ہے کہ نبی کی درخواست رد نہیں کی جاتی۔ ہاں ایسا ممکن ہے کہ کسی حکمت کے تحت اسے موخر کر دیا جائے یا کسی اور وقت کیلئے محفوظ کر لیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا معراج کی شب تک موخر کر دی گئی تھی اور آج اس کی قبولیت کا وقت تھا لہٰذا انہیں چھٹے آسمان پر کھڑا کر دیا گیا اور حکم فرمایا گیا کہ آج میرا محبوب ﷺ میری تجلیات کا مظہرِ اتم بن کر آ رہا ہے۔ تو اس کو دیکھتا جا اور اس آئینے میں میرے حسن کے پرتو سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک دیتا جا۔ لہٰذا میں اسے پچاس نمازیں دے کر بھیجتا ہوں، تو کمی کے بہانے لوٹاتے جانا، ہر بار محبوب مجھے مل کر آئے گا تو اسے دیکھتے جانا، اس طرح محبوب ﷺ کی ذات کے اندر میرا جلوہ کرتے جانا۔

صدیوں کا سفر چشمِ زدن میں

صدیوں پر محیط سفرِ معراج چشمِ زدن میں طے ہو گیا۔ براق پر مکہ معظّمہ میں واپسی ہوئی، صحنِ حرم میں تشریف لائے، پھر تہجد کے وقت اٹھے۔

حدیث پاک میں آتا ہے:

فاستیقضتُ و أنا بالمسجد الحرام۔ (ملاء اعلیٰ اور ملکوتی مشاہدہ سے وارِد شدہ اِستغراق کی کیفیت سے) واپس پلٹا تو مسجدِ حرام میں تھا۔ (الشفاء، ۱:۲۴۶)

صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسول بس

معجزۂ معراج کے ظہور سے ایوانِ کفر و شرک کا لرز اٹھنا ایک فطری امر تھا۔ چنانچہ ہر طرف شور مچ گیا۔ فتنہ و شر کے طوفان اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی کردار کشی کا اس سے ''زرّیں موقعہ'' کفار و مشرکین کے ہاتھ کہاں سے آتا! دعویٰ معراج کو بنیاد بنا کر مخالفینِ اسلام نے ایک منظّم سازش کا منصوبہ بنایا۔ یہ لوگ ہر وقت اس تلاش میں رہتے تھے کہ کسی طرح حضور ﷺ کے کسی دعوے کو معاذ اللہ جھوٹا ثابت کرسکیں۔ سو ابوجہل اور دیگر بدبختوں نے معراج کے واقعہ کو اپنے لئے بہت بڑی دلیل سمجھا اور وادیٔ مکہ میں شور برپا کر دیا۔ ہر طرف اپنے نمائندے بھیجے۔ شہرِ مکہ کے گلی کوچوں میں ایک غلغلہ پیدا ہو گیا کہ حضور ﷺ نے یہ کیا دعویٰ کر دیا! ابوجہل بھاگا بھاگا صدیقِ اکبرؓ کے پاس گیا کہ آج میں پوچھتا ہوں کہ تو اس نبی کے دعوے کی صداقت پر ایمان لاتا ہے۔ اب بتا تو کیا کہتا ہے کہ آج تیرے دوست نے ایک ایسا دعویٰ کیا ہے کہ تو کبھی اسے تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوگا۔ جب صدیق اکبرؓ نے ابوجہل کی زبانی دعویٔ معراج سنا تو مسکرا کر ارشاد فرمایا کہ میں تو محض حضور ﷺ کی زبانِ اقدس سے سن کر خالقِ کائنات کو مان چکا ہوں۔ یہ سب باتیں تو اس سے بہت ہی کم درجہ کی ہیں۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ نے حضور ﷺ کی بارگاہ سے تصدیق کئے بغیر سفرِ معراج کی تصدیق کر دی۔ اس صبح آپ ''صدیقِ اکبرؓ'' کے لقب سے سرفراز ہوئے یعنی ''سب سے بڑا تصدیق کرنے والا''۔ (تفسیر ابن کثیر، ۳: ۱۰۔۱۱)

علمِ حضور ﷺ کی آزمائش کی جسارت

کفار و مشرکین ابوجہل کی قیادت میں آقائے دوجہاں ﷺ کی بارگاہِ بیکس

پناہ میں حاضر ہوئے اور سفرِ معراج خصوصاً بیت المقدس کے بارے میں الٹے سیدھے سوالات کرنے لگے۔ مقصد یہ تھا کہ اللہ کے نبی کی کسی بات کو معاذ اللہ جھوٹ ثابت کیا جائے اور پھر اس مفروضے کو بنیاد بنا کر اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کے خلاف زبردست منفی پروپیگنڈہ مہم کا آغاز کیا جائے۔ چنانچہ حضور ﷺ سے سوال کیا گیا کہ بیت المقدس کے در و دیوار، چھتوں، دروازوں اور کھڑکیوں کی کیفیات بیان کریں۔ یہ سوال انہوں نے اس بنا پر کیا تھا کیونکہ وہ اپنے طور پر یہ فرض کئے بیٹھے تھے کہ اس سے قبل حضور ﷺ کبھی بیت المقدس نہیں گئے۔ وہ ان سوالات کے جوابات کیسے دے سکیں گے! اب ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص کسی عمارت کی سیر کرتا ہے تو وہ اسکے شہتیر اور کھڑکیاں وغیرہ تو نہیں گنا کرتا، لہٰذا حضور ﷺ پر لمحہ بھر تو اِنقباض کی کیفیت طاری ہوئی۔ اس پر اللہ رب العزت نے بیت المقدس کا ہر عکس حضور ﷺ کی بارگاہ میں پیش فرما دیا۔ چنانچہ بیت المقدس کے بارے میں جو بات مشرکینِ مکہ پوچھتے جاتے حضور ﷺ دیکھ دیکھ کر بتاتے جاتے کہ در و دیوار بیت المقدس میں کیا کچھ نصب ہے۔

عن جابر بن عبدالله، قال سمعتُ رسول الله ﷺ يقول: لما كذّبني قريش قمتُ في الحجر فجلّى الله لي بيت المقدس، فطفقت أخبرهم عن آياته و أنا أنظر إليه۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب قریش نے میری (معراج کی) تکذیب کی اس وقت میں حجرِ اسود کے پاس تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس میری نظروں میں عیاں کر دیا اور میں اسے دیکھ دیکھ کر اس کی تمام نشانیاں قریش کو بتانے لگا۔

۱۔ صحیح البخاری، ۲: ۶۸۴، کتاب التفسیر، رقم: ۴۴۳۳

۲۔ جامع الترمذی، ۲: ۱۴۱، کتاب تفسیر

القرآن، رقم: ۳۱۳۳
۳۔ صحیح لمسلم، ۱: ۹۶، کتاب الایمان، رقم: ۲۷۶
۴۔ مسند احمد بن حنبل، ۳: ۳۷۷
۵۔ مسند ابی عوانۃ، ۱: ۱۲۵، ۱۳۱
٦. شرح المواهب للزرقاني، ٦ : ١٢٧

قافلے والوں کے اُونٹ کی گمشدگی

مخبرِ صادق حضور رحمتِ عالم ﷺ بیتِ المقدس کے بارے میں کفار و مشرکین مکہ کے ہر سوال کا درست جواب دے رہے تھے۔ جب انہیں اپنی اس سازش میں ناکامی کی صورت دکھائی دینے لگی تو کہنے لگے کہ ہمارے بعض قافلے اس راہ پر گئے ہیں۔ کچھ ان کے بارے میں بتلایئے۔ حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ میں نے تمہارا پہلا قافلہ ''روحا'' کے مقام پر دیکھا تھا۔ اس قافلے کی قیادت فلاں قبیلے کا فلاں شخص کر رہا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ اس قافلے کا ایک اونٹ گم ہو گیا۔ وہ لوگ وہاں رک کر اپنے اونٹ کی تلاش میں گئے ہوئے تھے۔ جب میں وہاں پہنچا تو مجھے پیاس لگی۔ میں نے دیکھا کہ ان کے ایک اونٹ کے پالان کے ایک پیالے میں پانی پڑا ہے۔ میں نے اُتر کر اس پانی کو پی لیا۔ جب میں روانہ ہونے لگا تو مذکورہ شخص اونٹ کو تلاش کر کے واپس پہنچا تو میں نے جاتے ہوئے اسے سلام کیا تو قافلے والوں میں سے بعض نے کہا یہ تو محمد ﷺ کی آواز ہے۔ جب قافلے والے واپس آئیں تو ان سے دریافت کر لینا۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ خواب میں پیا ہوا پانی اس لائق نہیں ہوتا کہ پوچھا جائے کہ پیالے میں پانی تھا یا نہیں تھا اور پھر یہ کہ آوازِ رسول ﷺ کی پہچان

سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سفر حالتِ خواب میں نہیں عالمِ بیداری میں تھا۔

تاجدارِ کون و مکاں ﷺ نے فرمایا کہ جب میں مقام ''ذِی فجا'' پر پہنچا تو وہاں مجھے دوسرا قافلہ ملا۔ اس قافلے میں ایک اونٹ پر فلاں فلاں نامی دو دوست سوار تھے۔ جب میرا براّق ان کے قریب سے گزرا تو وہ اونٹ بدک کر بھاگا اور وہ دونوں اس سے گر پڑے۔ چنانچہ اس حادثے میں ایک کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ جب قافلے والے آئیں تو ان سے تمام اَحوال پوچھ لینا۔

حضور رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ''تِلوین'' کے مقام پر ایک تیسرا قافلہ دیکھا۔ کفار و مشرکین نے اس قافلے کے بارے میں کوئی علامت پوچھی تو تاجدارِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اس کے آگے بھورے رنگ کا ایک اونٹ ہے جس پر دو بوریاں لدی ہوئی ہیں۔ ایک سیاہ دھاری دار اور دوسری سفید دھاری دار، جب وہ قافلہ واپس آئے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔

کفارِ مکہ نے سوچا کہ تینوں دلیلیں قوی ہیں۔ لہٰذا جاتے ہوئے کہنے لگے کہ اتنا اور بتا دیجئے کہ وہ قافلے اندازاً کب تک مکہ پہنچ جائیں گے۔ اس پر آقائے دوجہاں ﷺ نے فرمایا کہ پہلا قافلہ کل سورج طلوع ہونے سے پہلے مکہ پہنچ جائے گا۔ دوسرا قافلہ اس وقت مکہ پہنچے گا جب سورج عین نصف النہار پر ہوگا جبکہ تیسرے قافلے کی آمد کا وقت سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے ہے۔ (المواھب اللدنیۃ، ۲:۴۰)

ابھی جملہ بھی مکمل نہ ہونے پایا تھا

قافلوں کی آمد کے وقت کا سن کر کافروں کا ایک گروہ مکہ معظّمہ کی سب سے اونچی پہاڑی پر جا کر بیٹھ گیا اور سورج کے طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ دوسری

طرف مسلمان بھی اپنے آقا ﷺ کے ارشادات کو حرف بحرف سچ ثابت ہوتا دیکھنے کے لئے گردِ کارواں کی تلاش میں تھے۔ عشاق قافلے کی طرف جبکہ کفار افق پر سورج کی تلاش میں تھے۔ جب سورج طلوع ہونے کا وقت قریب آیا تو ایک کافر بآواز بلند بولا: خدا کی قسم! سورج طلوع ہو گیا۔ ابھی یہ جملہ مکمل نہ ہو پایا تھا کہ صحابہ کرامؓ پکار اٹھے وہ دیکھئے قافلہ بھی پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر کفار کہنے لگے کہ ہم کچھ نہیں مانتے یہ تو جادو ہے۔ ایسا ہی معاملہ دوسرے قافلے کے ساتھ بھی ہوا جو حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق نصف النھار پر پہنچا۔

خورشیدِ فلک! یہیں رُک جا

تیسرے قافلے کو راستے میں کوئی حاجت پیش آ گئی لہٰذا اسے تاخیر ہو گئی۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا لیکن قافلے کی آمد کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس پر کفار و مشرکین چہ مگوئیاں کرنے لگے۔ غیرتِ حق جوش میں آئی، سورج کو حکم ہوا کہ یہیں رک جا۔ جب تک وہ قافلہ نہ پہنچے تجھے غروب ہونے کی اجازت نہیں۔ چنانچہ سورج افق کے کناروں پر رکا رہا، وقت گزرتا رہا حتیٰ کہ قافلہ نمودار ہو گیا۔ اس پر کفار سے جب کوئی بن نہ پڑا تو کہنے لگے: ہم نہیں مانتے یہ تو کھلا جادو ہے۔
(الشفاء، ۱:۲۸۴) (حجۃ اللہ علی العالمین: ۲۹۸)

ایک یہودی عالم کی تصدیق

سفرِ معراج کی قدم قدم پر اغیار کے حوالے سے تصدیق بھی ہو رہی تھی اور توثیق بھی، لیکن جن دلوں پر کفر کے تالے پڑے تھے انہیں سورج کی روشنی کیا نظر آتی! وہ معجزاتِ حضور ﷺ پر جادو کا لیبل لگا کر اپنے کفر کو تسکین دے لیتے۔ آج صدیاں

گزر جانے کے بعد جب سائنسی ارتقاء اپنی معراج کو چھو رہا ہے، کائنات کی بیکراں وسعتیں حضور ﷺ کے نقوشِ کفِ پا کی تصدیق کر رہی ہیں۔

کتبِ حدیث اور کتبِ تفسیر میں ایک یہودی عالم کا واقعہ بھی درج ہے۔ خاص طور پر امام ابنِ کثیرؒ نے اپنی تفسیر اور امام ابونعیم اصفہانیؒ نے دلائل النبوۃ میں بیان کیا ہے کہ محمد بن کعب الکربیؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنے صحابی دحیہ کلبیؓ کو قیصرِ روم کی طرف اسلام کا پیغام دے کر بھیجا۔ آپ نے اس عیسائی بادشاہ کو دعوتِ اسلام پہنچائی اور آقائے دو جہاں ﷺ کے فضائل اور مناقب بیان کئے تو اس نے کہا کہ میں عرب کے کچھ تاجروں سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ ان سے حضور ﷺ کے حالات بیان کرنے کو کہا گیا۔ ابوسفیانؓ کا بیان ہے کہ میں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ کسی طرح بادشاہ کی نظروں میں حضور ﷺ کا درجہ گر جائے اور وہ حضور ﷺ کو ماننے سے انکار کر دے لیکن محتاط بھی رہا کہ کسی جھوٹ پر پکڑا نہ جاؤں۔ ابوسفیانؓ نے کہا کہ اے قیصرِ روم! میں تمہیں اس نبی کی ایک ایسی بات بتاتا ہوں جسے سن کر تجھے (معاذ اللہ) اس کے جھوٹے ہونے کا یقین آ جائے گا۔ یہ کہہ کر واقعہ معراج بیان کیا۔ جب وہ اس مقام پر پہنچا کہ اس نبی نے کہا کہ میں برّاق پر سوار ہو کر بیت المقدس پہنچا جہاں بابِ محمد میرے لئے کھلا تھا۔ وہاں پتھر سے برّاق کو باندھا گیا تھا تو قیصرِ روم کے دربار میں موجود دنیائے عیسائیت کے سب سے بڑے پادری نے کہا کہ ہاں اس رات کا مجھے علم ہے۔ قیصرِ روم نے کہا تجھے اس رات کی کیا خبر ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ میرا معمول تھا کہ میں ہر رات مسجدِ اقصیٰ کے دروازے اپنے ہاتھوں سے بند کر کے اور تالے لگا کر سویا کرتا تھا۔ اس رات جب میں اس دروازے پر پہنچا تو وہ بند نہ ہوا۔ میں نے اپنے کئی ساتھیوں کو بلایا جنہوں نے مل کر زور لگایا مگر پھر بھی دروازہ بند نہ ہوا حتیٰ

کہ مستریوں کی سب کوششیں بھی بے کار گئیں لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ اب تو اسے کھلا چھوڑ کر سو جائیں۔ صبح اٹھ کر اسے بند کر دیں گے۔ پادری کہتا ہے کہ خدا کی قسم! اس رات میں دروازہ کھلا چھوڑ کر سو گیا لیکن ساری رات سوچتا رہا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ جب علی الصبح میں نے دروازہ بند کرنا چاہا تو وہی دروازہ جو رات کو بند نہ ہوا تھا اس وقت آرام سے بند ہو گیا۔ میں بھی حیران ہو رہا تھا کہ میری نظر دروازے کے باہر پتھر پر پڑی تو اس پر سواری کے باندھنے کا نشان تھا۔ اس پتھر کے بارے میں تاجدارِ کائنات حضور رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا تھا:

لما انتهينا إلى بيت المقدس قال جبرئيل بإصبعه، فخرق به الحجر و شدّ بها البُرّاق.

جب ہم بیت المقدس پہنچے تو جبرئیل نے اپنی انگلی سے اشارہ کیا تو اس پتھر میں سوراخ ہو گیا۔ پھر جبرئیل نے اس کے ساتھ براق باندھا۔

۱۔ جامع الترمذی، ۲: ۱۴۱، کتاب التفسیر، رقم: ۳۱۳۲

۲۔ المستدرک للحاکم، ۲: ۳۶۰، رقم: ۳۳۷۰

۳۔ مشکوۃ المصابیح، ۳: ۳۰۶، رقم: ۵۹۲۱

وہ یہودی عالم کہتا ہے کہ میں نے اس کیفیت کو دیکھا تو مجھے پرانی الہامی کتابوں میں پڑھا ہوا یہ واقعہ یاد آ گیا جو ہم انبیاء کی زبانی سنتے آئے ہیں کہ جب نبئ آخر الزماں ﷺ کا زمانہ آئے گا تو انہیں سفرِ معراج پر بلایا جائے گا اور وہ اس رات بیت المقدس آ کر انبیاء کی امامت کرائیں گے اور اس پتھر پر ان کی سواری باندھی جائے گی۔ میں سمجھ گیا کہ آج نبئ آخر الزماں ﷺ کی معراج کی رات ہے اور ابوسفیانؓ اپنے بیان میں سچا ہے۔

ابوسفیانؓ کہتے ہیں کہ جب میں نے یہ سنا تو میرے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی کہ یہ تو ایسی حقیقت ہے کہ عالمِ عیسائیت کا بڑا پادری بھی اپنی مخالفت کے باوجود جسے تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ امام ابونعیم اصفہانیؒ تو یہاں تک بیان کرتے ہیں کہ وہ پتھر ان کے زمانے تک موجود رہا۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم! لوگ آج بھی سواری باندھے جانے والی جگہ پر ہاتھ لگا کر برکتیں حاصل کرتے ہیں۔

(دلائل النبوۃ:۲۸۸)

ادھر سے کون گزرا تھا کہ اب تک
دیارِ کہکشاں میں روشنی ہے

باب چہارم

فصل اول: مراحل معراج کی تحقیق

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ دہلوی نے حضورﷺ کے اس مقدس مرحلہ وار سفر کے باب میں اپنی کتاب ''فوائد الفوائد'' میں تین اصطلاحات استعمال فرمائی ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۱-اسراء : مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا سفر

۲-معراج: بیت المقدس سے مرحلہ وار ساتوں آسمانوں اور سدرۃ المنتہیٰ تک کا سفر

۳-اعراج: سدرۃ المنتہیٰ سے مقام قاب قوسین تک عروج

(فوائد الفوائد، ۴: ۳۵۰)

سفر معراج کے ان تینوں مراحل کے ساتھ حضورﷺ کی تینوں شانوں کی انتہائی قرب و مناسبت کا پتہ چلتا ہے جسے اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد حقیقت و فلسفہ معراج کی تفہیم ممکن ہے اور اس سلسلے میں پیدا کئے گئے اشکالات خود بخود رفع ہو جاتے ہیں۔

اگرچہ یہ تینوں شانیں حضورﷺ کی ذات کا جز و لاینفک ہونے کے ناطے سے پہلو بہ پہلو موجود ہیں لیکن ان میں سے ہر ہر شان کا اظہار اپنے اپنے مقام و مرحلے پر ہوا۔ بحیثیت مجموعی معراج مصطفوی بشریت، نورانیت اور مظہریت و حقیقت کے تمام کمالات کی بدرجہ اتم جامع ہے۔ درآنحالیکہ کوئی شان دوسری شان سے متناقض نہیں ہے اور ان تمام کمالات کی انتہاء کو پہنچنے کے باوجود حضورﷺ کا مقام عبدیت و معبودیت کا امتیاز بہرحال قائم رہا۔ انوار و تجلیات کی بارش میں حضورﷺ مقام بندگی پر ہی رونق

افروز رہے۔

پیکر مصطفوی ﷺ جامع صفات و کمالات

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی تینوں شانوں بشریت' نورانیت اور حقیقت کو الگ الگ معراج نصیب ہوئی۔ اس پر ذہن میں ایک سوال آ سکتا ہے۔ کیا حضور ﷺ کی ایک شان کو دوسری سے ممیّز کیسے کیا جا سکتا ہے یعنی جب بشریت محمدی معراج سے مستفیض ہو رہی تھی تو دوسری شانیں کہاں تھیں اور اسی طرح جب آپ ﷺ کی ملکیت و حقیقت کو معراج کرائی جا رہی تھی تو بشریت کہاں تھی؟

اس سوال کے جواب میں روز مرہ زندگی میں انسان کے فطری احوال کا حوالہ دینا بے محل نہ ہوگا۔

مثال:- جب کوئی آدمی بات کر رہا ہوتا ہے تو اس سے تکلم بالفعل کی حالت ظاہر ہو رہی ہوتی ہے حالانکہ اس میں تکلم کے ساتھ ساتھ خموشی اور سکوت کی حالت بھی بالقوۃ موجود ہوتی ہے۔

مثال:- جب ایک باپ غصے کی حالت میں اپنے بچے کو اس کی خطا پر سزا دے رہا ہوتا ہے' اسے زدوکوب کر رہا ہوتا ہے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں پیار و محبت اور شفقت کا مادہ موجود نہیں ہے بلکہ اس وقت غصہ کی حالت غالب اور پیار و محبت کی صفت مغلوب ہوتی ہے۔

روز مرہ کے ان دو واقعات کو مثال (Analogy) کے طور پر پیش کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضور ﷺ کی شان بشریت کی معراج کے وقت آپ ﷺ کے بشری کمالات غالب تھے جبکہ آپ کی ملکیت اور حقیقت کی شانیں ابھی مغلوب تھیں۔ جب

آپ ﷺ کی نورانیت کو معراج نصیب ہوئی تو آپ ﷺ کے روحانی اوصاف و کمالات غالب اور بشریت وحقیقت کی شانیں مغلوب تھیں۔ اسی طرح جب آپ ﷺ کی حقیقت ومظہریت کو معراج سے سرفراز کیا گیا تو آپ ﷺ کی شان حقیقت ومحمدیت کا غلبہ تھا اور باقی دو شانیں مغلوب تھیں جبکہ تینوں شانیں اپنی اپنی جگہ موجود تھیں۔ کبھی ایک کا غلبہ ہو جاتا اور کبھی ایک کا۔

حاصل کلام یہ کہ معراج کے توسط سے حضور اکرم ﷺ کی ذات وصفات کے ہر پہلو اور ہر شان کی تکمیل بدرجہ اتم کر دی گئی اور آپ اوصاف وکمالات ایزدی کا مظہر اتم بن کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے لیکن ان کا کماحقہ ادراک عقل انسانی کی گرفت سے باہر ہے اور آپ ﷺ اس مقام پر جلوہ گر ہوئے جس مقام عظمت کا تصور بھی تمام نورانی اور خاکی مخلوقات کے لئے ممکن نہیں۔ بقول غالب

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
آں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

آیات ربانی کا مشاہدہ اور دیدار حق

معراج کی شب کوئی چیز براہ غیب میں نہ رہی۔ جب دیدار خداوندی کی سعادت نصیب ہوگئی، محبّ اور محبوب کے درمیان دو کمانوں سے بھی کم فاصلہ رہ گیا اور دوئی کا ہر تصور مٹ گیا تو وہ کونسی چیز تھی جو اس کے بعد بھی حضور ﷺ کی نظروں سے اوجھل رہی۔

معراج میں حضور ﷺ کو قیامت تک ہونے والے تمام واقعات کا علم عطا کر دیا گیا۔ جنت ودوزخ اور عالم اخروی کے حقائق کا مشاہدہ کروایا گیا۔ کتب حدیث میں ان کی تفصیلات شرح وبسط سے بیان کی گئی ہیں۔ ان مشاہدات کے بعد حضور ﷺ کے

قدوم میمنت لزوم عرش معلیٰ پر پہنچے اور پھر سدرۃ المنتہیٰ سے آگے بڑھنے کا مرحلہ آیا۔ جبرئیل علیہ السلام اس مقام پر رک گئے اور بڑے ادب سے عرض کیا کہ اس سے آگے مجھے بڑھنے کی مجال نہیں۔ اگر میں سوئی کی نوک کے برابر بھی آگے قدم رکھوں گا تو انوار الٰہی کی تجلیات سے جل کر راکھ ہو جاؤں گا۔ آپ تنہا آگے تشریف لے جایئے۔ شیخ سعدیؒ جبرئیل امین کے اس جواب کو اپنے شعر میں یوں بیان فرماتے ہیں۔

اگر یکسر موئے برتر پرم
فروغ تجلے بسوزد پرم

تمنائے جبرئیل امین

آنحضرت ﷺ نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا۔

هل من حاجت ربک کیا تیرے دل میں کوئی حاجت اور آرزو ہے جسے میں آپ کے رب تک پہنچادوں۔ (السیرۃ الحلبیہ، ۲: ۱۲۰)

جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ میرے دل میں فقط ایک آرزو ہے جو آپ میرے رب تک پہنچا دیجئے۔ وہ یہ کہ قیامت کے دن جب آپ کی گنہگار امت پل صراط سے گزرنے لگے اور گزرتے وقت اس کے قدم لڑکھڑانے لگیں تو باری تعالیٰ مجھے اس امر کی اجازت دیدیں کہ میں آپ ﷺ کی امت کے لئے پل صراط پر اپنے پر بچھا دوں تاکہ وہ سلامتی سے گزر سکے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں آپ کی یہ خواہش آپ کے رب تک پہنچادوں گا اور وہ اسے ضرور پورے فرمائے گا۔

ایك سوال:- یہاں ایک سوال ابھرتا ہے کہ جبرئیل امین نے اس خواہش کا اظہار کیوں کیا؟

جواب:۔ جبرئیل علیہ السلام کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ حضور ﷺ کو خوش کرنے کا طریقہ آپ کی امت کو خوش کرنے کے سوا اور کوئی نہیں۔ اس سے اس بات کا علم بھی ہوتا ہے کہ آقائے دوجہاں ﷺ کی رضا اپنی امت کی فلاح، بہتری اور خوشی میں مضمر ہے۔ سفر لامکاں کے لئے حضور ﷺ کی خدمت میں رفرف پیش کیا گیا جو کہ سبز رنگ کا ایک تخت تھا۔ آپ ﷺ اس پر سوار ہو کر اپنے رب کے قرب کی منزلیں طے کرنے لگے۔ سفر کا تیسرا مرحلہ آپ نے مظہریت وحقیقت کی طاقت سے سر کرلیا جبکہ بشریت و نورانیت دونوں اوصاف یہاں مغلوب تھے۔

سفر معراج میں آپ ﷺ کی تینوں شانوں یعنی بشریت، نورانیت اور حقیقت کو علیحدہ علیحدہ معراج نصیب ہوا۔ یہ تینوں شانیں جیسا دیس ویسا بھیس کے مصداق اپنے اپنے مقام پر غالب تھیں۔ اس ارضی دنیائے آب وگل میں آپ کی بشریت غالب تھی جبکہ باقی دو اوصاف مغلوب تھے۔ دنیائے ملکیت میں نورانیت کا رنگ غالب تھا اور عالم مظہریت میں حقیقت کا غلبہ تھا۔

شب معراج اللہ رب العزت نے آقائے دوجہاں ﷺ کو اپنے پاس بلایا تو آپ ﷺ کی مسرت وانبساط کی کوئی انتہا نہ تھی کیونکہ آپ ﷺ کو آپ کے محبوب نے بلوایا تھا۔ جس طرح عام انسان اپنے دوست کے بلانے پر خوش ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی حضور ﷺ کا دوست ہے۔ ایسا دوست کہ جس کی دوستی پر کائنات کی ساری دوستیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔ اس محبوب حقیقی نے آپ ﷺ کو بلاوا بھیجا۔ یہ اعزاز آج تک کسی اور کو نصیب ہوا اور نہ قیامت تک ہوگا کیونکہ عشق کی نگاہ میں وہی اول بھی ہیں اور وہی آخر بھی ہیں۔

دعوت محبوب کے انداز

کسی کو دعوت دینے کے مندرجہ ذیل تین مختلف انداز اور ڈھنگ ہوتے ہیں۔

۱۔ **پیغام بھیجنا:۔** کسی کو بلانے کا ایک انداز یہ ہے کہ دوست فقط خط کے ذریعے یا فون کر کے دوسرے دوست کو دعوت یا پیغام بھیج دے۔ مدعو (جانیوالا) اپنی سواری کا بندوبست کر کے اپنی کوشش سے دوست کے پاس پہنچ جائے۔

۲۔ **سواری بھیجنا:۔** جہاں پیار و محبت کا لحاظ اور پاسداری زیادہ ہو وہاں فقط پیغام بھیجتے بلکہ ساتھ گاڑی بھی بھیجی جاتی ہے تاکہ دوست اس پر سوار ہو کر ملنے کے لئے چلا آئے۔ دوست کو بلانا اور ساتھ گاڑی بھی بھیجنا یہ فقط بلاوا بھیجنے سے کہیں زیادہ عزت اور احترام و اکرام کی بات ہوتی ہے۔

۳۔ **نمائندہ بھیجنا:۔** فقط گاڑی بھیج دینا بھی خوشی کی بات ہے لیکن اگر بلوانے والا اپنی بارگاہ سے نہایت مقرب شخص کو بطور نمائندہ بھی بھیج دے، اس شان اور انداز سے بلایا جائے تو پھر خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

محبت کا انداز محبت

شب معراج محبوب حقیقی نے اپنے محبوب کو بلانے کے لئے پیغام نہ بھیجا بلکہ اپنی کائنات کی سب سے بڑھ کر سواری بھیجی۔

☆ **براق:۔** رسول پاک ﷺ کی سواری کے لئے اللہ جل مجدہ نے براق بھیجا اور ساتھ سدرۃ المنتہی کا مقیم، عالم خلائق کا سب سے بڑا شہسوار اپنا نمائندہ خاص بنا کر بھیجا کہ محبوب! اس براق پر سوار ہو کر میرے اس نمائندہ کے ساتھ میرے پاس آ جا۔

☆ **رفرف:-** سدرۃ المنتہی سے آگے جہاں براق کا سفر ختم ہوگیا وہاں رفرف نامی سبز رنگ کا تخت بھیجا۔ عالم لامکاں میں ایک ایسا مقام آیا جہاں رفرف بھی ٹھہر گیا۔

☆ **بقعہ نور:-** جب رفرف بھی ٹھہر گیا تو حضورﷺ کو ایک بقعہ نور کے اندر داخل کر دیا گیا۔

حضورﷺ فرماتے ہیں کہ اس نئے ماحول میں جہاں ہر طرف اللہ کی تجلیات اور جلوہ ہائے صفات موجزن تھے' میں نے کچھ اجنبیت سی محسوس کی اور ایسا ہونا بتقاضائے شان بشریت تھا جو اگرچہ مغلوب تھا لیکن آنحضرتﷺ کی شخصیت کا حصہ تھا۔

محبت کی باتیں

سفر معراج میں ہر قدم پر محبت الٰہی کا جمال نظر آتا ہے۔ محبوبیت کا یہ مقام حضورﷺ کے لئے مختص تھا اور حضورﷺ کے لئے مختص رہے گا کیونکہ نہ کوئی ان کا مماثل اور نہ کوئی ان کا مثیل' تنہا وہی مقام محبوبیت پر رونق افروز ہیں۔ ہم غلاموں کی محبت بھی رب کائنات کی اسی محبت کا ہلکا سا پرتو ہے اور اصل میں محبت رسول بھی سنت رب جلیل ہے۔ شب معراج پروردگار عالم اپنے مہمان ذی حشم پر صلوۃ پڑھ رہا ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ میرے بندو میرے رسول کی محبت میں فنا ہو جاؤ' سینوں میں اسی رسول کے عشق کے چراغ جلاؤ۔

امام شعرانیؒ ''الطبقات الکبریٰ'' میں یوں رقمطراز ہیں۔

''آپﷺ نے فرمایا اس نامانوس ماحول میں اجنبیت اور تنہائی کا احساس ہونا ہی تھا کہ میرے کانوں میں دلنواز' میٹھی اور سریلی پیار بھری آواز آئی' کوئی نرم اور شفقت آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا''۔

قف یا محمد ان رب یصلی اے محمد! ٹھہر جا تیرا رب تجھ پر صلوٰۃ پڑھ رہا ہے۔ (الیواقیت والجواھر، ۲:۳۵)

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے خدا تعالیٰ کے صلوٰۃ پڑھنے پر قدرے تعجب ہوا لیکن دوسری بار پھر یہی شیریں آواز کانوں میں رس گھولی ہوئی آئی تو وحشت اور پریشانی کا اثر زائل ہوگیا اور اس کی جگہ سکون واطمینان نے لے لی۔

صلوٰۃ کا مفہوم کیا ہے؟

صلوٰۃ سے عام طور پر درود بھیجنے اور برکت کے معانی مراد لئے جاتے ہیں لیکن مندرجہ بالا حدیث میں صلوٰۃ کے یہ معانی نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ہر وقت آپ ﷺ پر درود بھیجتا رہتا ہے جس کی تائید قرآن کے ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلائِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی ﷺ پر صلوٰۃ بھیجتے ہیں۔

(الاحزاب، ۳۳:۵۶)

اس آیت کی رو سے اللہ رب العزت اس وقت بھی آپ ﷺ پر درود پڑھ رہا تھا جب آپ ﷺ ابھی سفر معراج کے لئے روانہ بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت بھی پڑھ رہا تھا جب حضور ﷺ معراج کے لئے روانہ ہوکر مسجد حرام سے بیت المقدس پہنچے۔ وہاں سے عالم بشریت کو پیچھے چھوڑتے ہوئے عالم نورانیت کی طرف رواں دواں ہوئے۔ سدرۃ المنتہی اور عرش معلیٰ پر پہنچے تھے۔ خدا تو ہر لمحہ درود پڑھ رہا تھا لہٰذا اس مقام پر صلوٰۃ کا معنی درود پڑھنا نہیں لیا جا سکتا۔ یہ مقام کسی اور معنی کا متقاضی ہے۔

صلوٰۃ کا ایک معنی قرب چاہنا اور قریب کرنا بھی ہوتا ہے۔ یہاں محبوب ﷺ

کو جو روکا جا رہا تھا کہ محبوب رک جاؤ۔ آپ کا رب آپ پر صلوٰۃ پڑھ رہا ہے تو اس سے مراد درود نہیں بلکہ قریب ہونا ہے۔

آسمانوں پر مہمان عرش کا بے مثال استقبال

دستور یہی ہے کہ جب کسی مہمان ذی وقار کو اپنے گھر دعوت دی جاتی ہے تو گھر کے در و دیوار میں مہمان گرامی کی راہ میں اپنی پلکیں بچھا دیتے ہیں۔ گھر بار کی آرائش پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے اور خاطر مدارت کے بعد تحائف دے کر اسے رخصت کیا جاتا ہے کہ مہمان اپنی اس عزت پر سجدہ شکر بجالاتا ہے۔

جب کوئی شخص کسی مہمان کو بلاتا ہے تو وہ اس آنے والے مہمان کا گھر سے نکل کر استقبال کرتا ہے۔ بلاتمثیل اللہ تعالیٰ نے شب معراج اپنے محبوب ﷺ کو اپنے پاس بلایا تھا اس لئے فرمایا محبوب! ﷺ یہاں تک چل کر آئے ہیں۔ اب آپ رک جائیں۔ دستور میز بانی کے مطابق اب میری رحمت اور شان بندہ نوازی تیرا استقبال کرے گی اور اپنی شان کے لائق آگے بڑھ کر تیرا استقبال کر کے حق میز بانی ادا کرے گی تا کہ تیری عظمت و محبوبیت کا اظہار ہو۔ اس معنی کی تائید قرآن کی مندرجہ ذیل آیت سے ملتی ہے۔

ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی پھر یہ قریب ہوا پھر وہ اور قریب ہوا۔

(النجم، ۸:۵۳)

دنی اور تدلی میں فرق

۱- **دنٰی** کا معنی ''قرب'' ہے اور **تدلّٰی** کا معنی بھی ''قریب ہونا'' ہے لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ دنی میں تین حروف (د، ن، ی) ہیں جبکہ تدلی میں حروف (ت، د،

ل،ی) کی تعداد چار ہے۔ عربی کا قاعدہ ہے کہ کثرت حروف کثرت معنی پر دلالت کرتی ہے اور قلت حروف قلت معنی پر دلالت کرتی ہے۔ دنی فعل مصطفی ﷺ ہے اور تدلی فعل خدا۔ دنی کے کم حروف سے پتہ چلتا ہے کہ محبوب چونکہ مخلوق میں سے تھا اور مخلوق محدود ہے اس لئے اس کا قرب بھی محدود ہے اور رب چونکہ خالق اور لامحدود ہے اس لئے اس کا قرب بھی لامحدود تھا۔ اللہ اللہ ہے اور بندہ بندہ۔ اللہ خالق ہے اور بندہ اس کی مخلوق۔

حضور اکرم ﷺ ایک مقام پر پہنچ کر رک گئے لیکن اللہ تعالیٰ اتنا قریب ہوا کہ کوئی حد باقی نہ رہی۔ ''دنی'' کا جواب باری تعالیٰ نے ''تدلی'' کی صورت میں دیا اور ایسا کیوں نہ ہو۔ حدیث قدسی میں اللہ کا اپنا فیصلہ ہے۔

من تقرب منی شبرا تقربت منه ذراعا.........الخ

جو شخص ایک بالشت بھر میرے قریب ہوتا ہے میں پورا گز اس کے قریب ہوتا ہوں اور جو میری طرف پیدل چل کر آتا ہے میں دوڑ کر اس کی طرف جاتا ہوں (اپنی شان کے مطابق)۔

۱۔ صحیح البخاری، ۲: ۱۱۰۱، کتاب التوحید، رقم: ۶۹۷۰
۲۔ صحیح لمسلم، ۲: ۳۴۳، کتاب الذکر ولدعاء، رقم: ۲۲
۳۔ جامع الترمذی، ۲: ۲۰۰، کتاب الدعوات، رقم: ۳۶۰۳
۴۔ سنن ابن ماجہ، ۲: ۱۲۵۵، رقم: ۳۸۲۱

جس طرح یہاں شبراً کا جواب ذراعاً سے دیا۔ اسی طرح زیر بحث آیہ کریمہ میں دنی کا جواب تدلی سے دیا۔

۲۔ سورہ نجم میں **ثم دنی فتدلی** میں قرب کا ذکر دو دفعہ بتکرار آیا ہے حالانکہ ایک دفعہ کہنا بھی مکتفی ہوسکتا تھا۔

شیخ بقلی شیرازیؒ اور بہت سے دیگر عرفاء کاملین نے اس پر لطیف نکات بیان کئے ہیں۔ انہوں نے بحرِ عرفان میں غواصی کر کے بہت سارے گہر ہائے نایاب دریافت کئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ قرب کا ذکر یہاں دو مرتبہ اس لئے ہوا کہ معراج میں حضور ﷺ کو دو قرب نصیب ہوئے۔ قربِ صفات اور قربِ ذات یعنی اللہ رب العزت کی صفات اور ذات دونوں نے حضور ﷺ کو اپنے حصارِ التفات میں لے لیا۔

۱۔ قربِ صفات

اس قرب میں ثُمَّ دَنٰی کی صورت میں ذاتِ باری تعالیٰ نے اپنی صفات تجلیات سے حضور ﷺ کو اپنی صفات سے اتنا قریب کر لیا کہ صفاتِ محمدیہ پر صفاتِ الٰہیہ کا رنگ چڑھ گیا یہاں تک کہ آپ صفاتِ الٰہیہ کے مظہرِ اتم بن گئے۔ یہ صفاتِ الٰہیہ کے حوالے سے حضور ﷺ کی معراج تھی۔

۲۔ قربِ ذات

جب آنحضور ﷺ کو صفاتی قرب سے مکمل طور پر بہرہ ور کر دیا گیا تو پھر تجلیاتِ ذات آپ پر جلوہ فگن ہوئیں جس سے آپ ﷺ کو وہ ملکہ حاصل ہو گیا کہ آپ چشمِ سر اور چشمِ دل دونوں سے خدا کا دیدار کر سکیں۔ یہ قرب تدلّی کی صورت میں عطا ہوا۔ حضور ﷺ اللہ رب العزت کی ذات کے سائبانِ کرم میں تھے۔ یہ مقام حاصل کرنے والے حضور ﷺ پہلے اور آخری بندے اور رسول ہیں۔

جب آنحضور ﷺ صفاتِ باری تعالیٰ کے مظہرِ اتم بن گئے تو آواز آئی کہ اے حبیب! ﷺ آگے بڑھیئے۔ آپ آگے بڑھتے گئے یہاں تک کہ حبیبِ لبیب ﷺ اور محبّ کے درمیان فاصلہ کم ہوتے ہوتے دو کمان یا اس سے بھی کم رہ گیا۔ مقامِ قاب

قوسین پر قرب و وصال کی وہ منزل آ گئی جو معراج کا نقطہ کمال (Climax) تھا۔ اس سے زیادہ قرب ممکن ہی نہ تھا۔ بایں ہمہ عبد کامل اور معبود حقیقی کے مابین وہ فرق و امتیاز قائم و دائم رہا جو نکتہ توحید کی اساس ہے۔

قاب قوسین سے کیا مراد ہے؟

سفر معراج میں قاب قوسین کا ذکر جمیل اس تواتر سے ہوا ہے کہ ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ قاب قوسین سے کیا مراد ہے؟ اس کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟ قرآن حکیم میں اللہ رب العزت نے اپنے حبیب ﷺ سے انتہائی قرب و وصال کو قاب قوسین کی بلیغ و جمیل عام فہم تمثیل سے بیان فرمایا ہے تاکہ عرب اپنی روزمرہ زبان اور محاورے کے مطابق اس بات کا مفہوم پوری طرح سمجھ سکیں۔ قوسین سے مراد کمانیں یا ابرو یا بازو ہیں اور ''قاب'' فاصلے کی اس مقدار کو کہتے ہیں جو دو کمانوں کے درمیان ہوتی ہے۔ جب دو بچھڑے ہوئے دوست مدت بعد ملتے ہیں تو ان کے ملنے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ ایک ہاتھ کمان کی صورت میں اوپر اٹھتا ہے اور دوسرا دوست اسی طرح قریب آ کر اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتا ہے تو نصف دائرے کی شکل میں دوسری کمان بن جاتی ہے۔ جب دونوں کے مابین معانقے کا عمل تکمیل کو پہنچتا ہے تو ان میں دو کمانوں کا یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ جاتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ خدا کی ذات معانقے اور ان لوازمات سے پاک ہے لیکن اپنے حبیب ﷺ سے قرب کی انتہائی صورت کو بیان کرنے کے لئے اس تمثیل کے ذریعے بات ذہن نشین کرائی گئی ہے ورنہ باری تعالیٰ تو ہر مثل سے پاک ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ — اس کی مثل کوئی شئے نہیں۔

(شوریٰ، ۴۲:۱۱)

ہر شئے سے پاک ہونے کے باوجود پھر فرمایا۔

مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ (النور ۲۴:۳۵)	اس کے نور کی مثال (جو نور محمدی کی شکل میں دنیا میں روشن ہوا) اس طاق (نما سینہ اقدس) جیسی ہے جس میں چراغ (نبوت روشن) ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ باری تعالیٰ ہمیں سمجھانے کے لئے مثال ارشاد فرماتا ہے۔ خود اسے مثال کی حاجت وضرورت نہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا کہ

اِنَّ اللّٰهَ لاَ يَسْتَحْيٖ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلاً مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا (البقرہ ۲:۲٦)	بے شک اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں شرماتا کہ (سمجھانے کے لئے) کوئی بھی مثال بیان فرمائے (خواہ) مچھر کی یا (ایسی چیز کی جو حقارت میں) اس سے بڑھ کر ہو۔

قاب قوسین کا تہذیبی، ثقافتی اور مجلسی پس منظر

اسلام دین فطرت ہے۔ ہر مرحلہ پر انسانی نفسیات کو مدنظر رکھتا ہے۔ قرآن کا اسلوب ہدایت بھی یہ ہے کہ جب وہ کوئی بات اپنے بندوں کو ذہن نشین کرانا چاہتا ہے تو ان کے سماجی پس منظر کو نظر انداز نہیں کرتا اور وہ ان کے ماحول کے مطابق انہیں مخاطب کر کے یا کسی تمثیل یا محاورے کے ذریعہ اپنی ہدایت کی ترسیل کے عمل کو مکمل کرتا ہے۔ چونکہ اہل عرب قرآن کے اولین مخاطبین ہیں اس لئے عرب رسم ورواج کا ثقافتی پس منظر قرآن میں اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔

اہل عرب کے قدیم دستور و رواج کا مطالعہ کرنے سے قاب قوسین کی معنویت کی ایک اور پرت کھلتی نظر آتی ہے۔ جب دو متحارب عرب قبیلے دشمنی کی راہ ترک کر کے ایک دوسرے سے شیر و شکر ہونا چاہتے تو ان کے سردار معاہدہ دوستی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے علامتی طور پر دو کمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر تیر چلاتے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا کہ آج کے بعد دونوں حلیف قبیلوں کا دوست اور دشمن ایک ہوگا۔ ایک کا دوست دوسرے کا دوست اور ایک کا دشمن دوسرے کا دشمن متصور ہوگا اور صلح و جنگ کے معاملوں میں دونوں کا رویہ ایک دوسرے سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو گا۔

۱۔ (معارج النبوۃ، ۳: ۱۴۶) ۲۔ (تفسیر حسینی، ۲: ۳۵۸) ۳۔ (کمالین حاشیہ جلالین: ۴۳۷) ۴۔ (روح المعانی، ۲۷: ۴۸)

عبد و معبود کا فرق قائم رہا

تاج عظمت حضور ﷺ کے سر اقدس پر رکھا گیا۔ معراج کی شب فضیلتیں قدم قدم پر آپ کے ہمرکاب رہیں۔ آقائے دو جہاں ﷺ جب مقام قاب قوسین پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے مزید قریب کر کے سریر آرائے اوادنیٰ پر متمکن ہونے کا شرف بخشا۔ قاب قوسین کے بعد اوادنیٰ کہہ کر قرآن خاموش ہو گیا کیونکہ اگر قاب قوسین تک بات ختم ہو جاتی تو قرب متعین ہو جاتا لیکن خدا تعالیٰ تو سب فاصلہ مٹانا چاہتا ہے اسی لئے فرمایا او ادنیٰ دو کمانوں کی مثال لوگوں کو سمجھانے کے لئے دی حالانکہ محبوب ﷺ اور محبّ کے درمیان فاصلہ تو اس سے بھی کم تر ہے۔ ادنیٰ کے بعد حتی یا الیٰ نہیں لگایا اس لئے کہ یہ حد بھی مقرر نہ ہو جائے کہ کہاں تک فاصلہ کم ہوا۔ او ادنیٰ کا لفظ ہمیں یہ بتا رہا ہے کہ محبّ اور محبوب کے درمیان فقط ایک فرق عبد و معبود کا قائم رہا۔ باقی سب فاصلے

اور امتیازات ختم ہو گئے۔

احدیت اور احمدیت کی قوسین

سفرِ معراج میں اللہ رب العزت کے جلال و جمال کی رعنائیاں لامکاں کی وسعتوں میں ہر طرف بکھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ رب کائنات کی الوہیت کے پرچم ہر سمت لہرا رہے ہیں۔ **فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى** سے اگلی آیت **فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى** ہمیں الوہیت کا درس دے رہی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے ''پس اس (خدا) نے وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی'' یعنی باوجود اس انتہائی قرب کے وہ عبد اور میں معبود، وہ مخلوق اور میں خالق، وہ مملوک اور میں مالک رہا۔ میں نے ہی اسے عالم انسانیت کی طرف مبعوث کیا تاکہ وہ انہیں ضلالت و گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر رشد و ہدایت کے اجالوں کی طرف لے جائے لیکن یہ امر ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ اب الوہیت و رسالت ایک دوسرے کے اتنا قریب ہیں کہ کفر و ایمان کے معاملوں میں ایک پر ایمان دوسرے پر ایمان اور ایک کا انکار دوسرے کا انکار کے مترادف ہے۔ اب تم میرے رسول ﷺ کے حلقہ بگوش ہو کر میری اطاعت کا اقرار کر سکو گے۔ اگر تم نے اس کی غلامی سے انحراف کی راہ اختیار کی تو تم فی الواقعہ اپنے اس فعل سے میری توحید سے منحرف ہو جاؤ گے۔ توحید و رسالت پر ایمان میں کسی قسم کا فرق روا رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ احدیت و احمدیت کی قوسین باہم ایک دوسرے سے اتنی متصل ہو گئیں کہ ان سے میرے قرب و وصال اور عشق و محبت ہی کا پتہ چل رہا ہے۔ تقرب الی اللہ کا دعویٰ بغیر عشق رسول ﷺ کے' بے بنیاد ہے۔

مقام قاب قوسین پر جب حجابات اٹھا دیئے گئے اور **ما زاغ البصر و ما طغٰی** کے مصداق شانِ محبوبیت یہ تھی کہ نگاہ محبوب ﷺ نہ ہٹی اور نہ ہی حد سے بڑھی بلکہ

وصال و دید کا وہ عالم تھا کہ چشم نظارہ ایک لحظہ بھی جمال جہاں آ راء سے نہ ہٹنے پائی اور احدیت و احمدیت کی قوسین اس طرح مل گئیں کہ باہمی قرب کی کیفیت **ثم دنی فتدلی** کی آئینہ دار بن گئی اور آخر میں **قاب قوسین** کے مقام پر دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب ہو گئے کہ درمیانی فاصلہ برائے نام رہ گیا۔

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قربت کا ذکر کرتے ہوئے درمیان میں فاصلہ رہنے کا ذکر لابدی اور ضروری سمجھا گیا اس لئے کہ خالق و مخلوق میں چاہے کتنا ہی قرب کیوں نہ ہو' ان کی ہستی جدا جدا ہے اور دونوں کا ایک وجود (Entity) نہیں مانا جا سکتا کہ محبوبیت کے اعلیٰ اور ارفع مقام پر پہنچ کر بھی عبدیت اور معبودیت کا فرق برقرار رہتا ہے۔ یہاں ایک بات خاص طور پر ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ جو شخص عبد و معبود کے فرق کو مٹاتا ہے' کافر ہے۔ عقیدے میں' عقل میں یا ایمان میں' عشق میں یا محبت میں الغرض کسی درجے میں بھی یا کسی سطح پر بھی بندہ رب ہو سکتا ہے نہ رب بندہ ہو سکتا ہے جو عبد کو معبود بنائے یا معبود کو عبد' وہ کافر ہے اور جس طرح عبد اور معبود کا فرق مٹانا کفر ہے اسی طرح فرق عبد و معبود کے سوا کوئی اور فرق ڈالنا بھی کفر ہے۔ سو اعتقاد یہی رکھنا چاہیئے کہ مقام او ادنیٰ پر پہنچ کر بھی خدا خدا ہے اور نبی نبی ہے۔

مقام عبدیت

اللہ رب العزت کائنات ارض و سماوات کا خالق ہے۔ ہر چیز اس کے دائرہ قدرت میں ہے۔ اس نے معراج کی شب اپنے بندے اور رسول پر عنایات کی بارش کر دی اور اسے وہ عظمت عطا کی جو آج تک نہ کسی رسول کا مقدر بن سکی اور نہ قیامت تک بن سکے گی۔

اس مقام پر پہنچ کر جہاں تمام دوریاں ختم ہو گئی تھیں قرآن زبان حال سے

یوں گویا ہوا۔

فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی　　پھر (اللہ رب العزت نے بلاواسطہ) اپنے بندہ کو جو وحی فرماتا تھا فرمائی (جو دینا تھا دیا جو بتانا تھا بتایا)

(النجم، ۵۳:۱۰)

معلوم ہوا کہ مخلوق میں عبدیت سے بہتر کوئی مقام نہیں مگر افسوس کہ آج لوگ اسی پر جھگڑتے پھرتے ہیں۔ اے کاش! انہیں حقیقت عبدیت سمجھ آ جاتی۔

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی
مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

عقیدہ توحید اور واقعہ معراج

عقیدہ توحید مومن کے ایمان کا مرکز و محور ہے۔ شرک کا سایہ بھی انسان کو دائرہ ایمان سے خارج کر دیتا ہے۔ سفر معراج حضور ﷺ کا ایک معجزہ ہے اور معجزہ رب کائنات کی قدرت مطلقہ کا مظہر ہوتا ہے۔ سفر معراج میں بھی توحید ربانی کے پرچم ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ آدم سے حضور ﷺ تک تمام انبیاء جس آسمانی ہدایت کے ساتھ مبعوث ہوتے رہے اس کا مرکزی نقطہ بھی توحید ہی تھا کہ وہی ذات بندگی کے لائق ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ وحدہ لاشریک ہے، کوئی اس کا ہمسر ہے نہ ثانی، نہ اس کی کوئی انتہا ہے اور نہ ابتداء ہے۔ وہ ازل سے ہے اور ابد کے بعد بھی وہی ہے۔ جب کچھ نہ تھا تو وہ تھا جب کچھ نہ ہوگا تو پھر بھی اس کی ذات یکتا و تنہا ہوگی۔ اس ذات کو نہ اونگھ ہے نہ زوال، وہ ہر حاجت سے پاک اور مبرا ہے اور وہ ہر کسی کا حاجت روا ہے۔

امم سابقہ نے اکثر و بیشتر مسئلہ توحید کے بارے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ ان کے

اکثر افراد (الا ماشاء اللہ) نے اپنے نبی کو اس کے کمالات و روحانی تصرفات دیکھ کر الوہیت کے درجہ پر پہنچا دیا۔ ان میں سے کسی نے نبی کو خدا کا بیٹا کہا اور کوئی تثلیث کا قائل ہو گیا۔ گویا نبی کو مقام نبوت سے ہٹا کر خدا کا شریک ٹھہرا لیا تاہم امت مصطفوی کو یہ شرف و افتخار حاصل ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے عطا کردہ عقیدہ توحید کی تعلیم ان کے قلوب و اذہان میں اس درجہ راسخ ہو گئی کہ اس پر شرک کی گرد پڑنے کا بھی کوئی احتمال باقی نہ رہا۔

اپنے حبیب ﷺ کو قرب کا انتہائی مقام تفویض کر کے ارشاد ہوتا ہے **اوحی الی عبدہ ما اوحی** ''ہم نے اپنے بندے کی طرف وحی کی'' اللہ اللہ! بندگی کا کیا مقام ہے کہ خدائی کا مختار کل بنا دیا جائے تو پھر بندہ رہے۔ عقیدہ توحید میں کسی قسم کے خلجان اور التباس کی کوئی گنجائش نہیں کہ خالصیت اور عبدیت کے فاصلے کا پاٹنا ناممکنات میں سے ہے۔ اس فاصلے کو برقرار رکھنا بہر حال ناگزیر ہے۔

فصل دوم:

معراج کیوں............؟

معجزۂ معراج النبی ﷺ کا وقوع پذیر ہونا تاریخ ارتقائے نسلِ انسانی کا ایک ایسا درخشندہ باب ہے جس کا ایک ایک حرف عظمت و رفعت کی ہزار ہا داستانوں کا امین اور عروجِ آدم خاکی کے ان گنت پہلوؤں کا مظہر ہے۔ نقوشِ کفِ پائے محمد ﷺ سے لوحِ افلاک پر شوکت انسانی کی جو دستاویز مرتب ہوئی وہ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی دلیل ہی نہیں بلکہ ایک ایسا مینارۂ نور بھی ہے جو تسخیر کائنات کے ہر مرحلے پر آنے والی ہر نسلِ انسانی کے راستوں کو منور کرتا رہے گا اور آسمانوں کی حدود سے نکل کر اولاد آدم کو مشاہدۂ فطرت کی ترغیب دیتا رہے گا اور اس پر نئے آفاق کے مقفل دروازوں کو وا کرتا رہے گا۔ معجزۂ معراج النبی ﷺ میں کئی ایک حکمتیں پوشیدہ ہیں، دلجوئی محبوب سے لے کر عظمت محبوب ﷺ تک منشائے ایزدی کے کئی پہلو ذہن انسانی پر آشکار ہوتے ہیں حقیقت احوال اللہ اور اللہ کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں تاہم اربابِ فکر و نظر نے اپنے علم اور فہم کے مطابق اس عظیم سفر آسمانی کی مختلف حکمتیں بیان کی ہیں اس مقام پر ہم ان میں سے صرف دو حکمتوں کا ذکر کریں گے۔

ا۔ نگاہوں میں جو تم ہو

واقعہ معراج کی پہلی حکمت یہ بیان کی جاتی ہے کہ اعلان نبوت کے ساتھ ہی حضور ﷺ پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ کفار کی طرف سے ایذا رسانی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کو اذیتیں دینے کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا مگر آپ ﷺ کے قدم نہ ڈگمگا سکے۔ بالآخر اہل مکہ اور قریش نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ معاشرتی سطح پر حضور علیہ السلام اور آپ ﷺ کے پورے خاندان کا بائیکاٹ کر کے آپ ﷺ کو حرمِ کعبہ کے قریب ایک گھاٹی شعب ابی طالب میں محصور کر دیا جائے۔ حضور ﷺ کے والدین اور دادا تو حضور ﷺ کے بچپن ہی میں انتقال کر چکے تھے۔ اب آپ ﷺ کی کفالت اور پرورش آپ ﷺ کے چچا حضرت ابوطالب کے سپرد تھی۔ جو تمام تر

مخالفتوں کے باوجود آپ ﷺ کا ساتھ دیتے چلے آ رہے تھے۔سو وہ بھی اس بائیکاٹ کا شکار ہوئے جبکہ آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہ الکبریٰ بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھیں۔ اس طرح نبوت کے ساتویں سال سے دسویں سال تک کبھی بھوکے رہ کر اور کبھی سوکھے پتے کھا کر گزارا کیا۔ آخر کار کفار نامراد ہوئے اور یہ بائیکاٹ ختم ہوا۔ اسی سال حضرت ابوطالب اور ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کا وصال ہوگیا۔ اس سے تمام ظاہری سہارے اور رشتے ٹوٹ گئے اور آقا علیہ السلام کے قلب انور پر دکھ کی سی کیفیت طاری رہنے لگی۔ اب نہ تو والدہ ماجدہ تھیں کہ دکھ کے وقت سینے سے لگا کر دلاسا دیتیں نہ والد تھے کہ دست شفقت سر پر رکھتے، نہ وفا شعار بیوی تھی کہ اپنے حسن سلوک اور محبت سے غم دور کرتیں، نہ کوئی اور بزرگ اور مشفق ہی تھا کہ جس کی شفقت اور محبت کی فراوانی سے اس کی کفار مشرکین کی چیرہ دستیوں کی تلافی ہو جاتی۔ فضا مخالفت اور سازشوں کی گرد سے اٹی ہوئی تھی۔ بظاہر اپنائیت کا حصار دلکشا ٹوٹ رہا تھا۔ حروف وفا کی خوشبو سے فضا عاری تھی، قدم قدم پر شقاوتِ قلبی کا پہرہ تھا۔ چنانچہ ایسے حالات میں اللہ رب العزت نے چاہا کہ سارے غم، رنج و بلا، دکھ درد اور پریشانیاں دور کردی جائیں اور یہ اسی طرح ممکن تھا کہ محبوب کو قاب قوسین پر بلا لیا جائے کہ جب محبوب کا مسکراتا ہوا چہرہ سامنے ہو اور ملاقات میں خلوت میسر ہو تو محبت کرنے والوں کے دلوں میں کوئی دکھ اور ملال باقی نہیں رہتا بلکہ ایک ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ مزید دکھوں کی خواہش کرتا ہے اور زبان حال سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ اے غمو تم امڈ امڈ کر آ ؤ تاکہ محبوب کے دیدار کا راستہ صاف ہو۔ گویا اللہ رب العزت بیان کرنا چاہتا ہے کہ محبوب ﷺ اگر دنیا میں دکھ اور غم آئیں، مخالفت کا سامنا ہو تو گھبرانہ جایا کرو کہ ہماری پیار بھری آنکھیں تجھی پر لگی رہتی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعۡيُنِنَا۔	اپنے رب کے حکم کی خاطر صبر کر، بیشک تو ہماری آنکھوں میں ہے (ہم تجھی کو دیکھتے رہتے ہیں)۔
(الطّور، ۵۲ : ۴۸)	

۲۔ امت سے پیار

اعلانِ حق کے بعد مخالفت کی جو آندھیاں اٹھیں، سازشوں کا جو جال بچھایا گیا روشنی کی راہ میں جو دیواریں اٹھائی گئیں، کفر والحاد کے نمائندگان نے پیغامِ توحید کو جس طرح جھٹلا کر نظام باطل کے تحفظ کا عہد نامہ تحریر کیا وہ راہ حق کے مسافروں کے لئے باعثِ ملال ضرور ہوا لیکن پرچم توحید لہرانے والوں کے قدم مشاہدہ ایمان وایقان پر آگے ہی بڑھتے گئے، ہر طرف پیغمبرانہ بصیرت کے چارغ روشن تھے، عزم واستقلال کے الفاظ کو نیا مفہوم عطا ہو رہا تھا۔ ایثار وقربانی کی نئی داستان لکھی جا رہی تھی، بارگاہ خداوندی میں سجدہ ریزی کمال بندگی کی مظہر بھی، لب اقدس پر خدائے وحدہ لاشریک کی حمد وثنا کے پھول کھل رہے تھے، ساری رات انوار بندگی کے جھرمٹ میں گذر جاتی، پروردگار عالم نے اپنے محبوب ﷺ کی یہ مشقت دیکھ کر ہدایت آسمانی کی آخری دستاویز میں فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ؕ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ۝ (المزمل، ۷۳:۱۔۴)	(آپ) رات کو قیام فرمایا کریں مگر تھوڑی رات، آدھی رات یا اس سے بھی کچھ کم کر لیں۔ یا اس سے بھی کچھ زیادہ اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کریں ۝[۱]

[۱] کتنا پیار بھرا انداز ہے کہ رب ہو کر بھی یوں نہیں فرماتا کہ بس یوں کرلو بلکہ کئی صورتیں بیان کر دیتا ہے کہ اگر طبعیت چاہے تو یوں کرلو ورنہ دوسری صورت موجود ہے اس پر عمل کرلو۔ ورنہ وہ مالک اگر چاہتا تو ایک حتمی حکم دے سکتا تھا کہ بس اور کسی چیز کی گنجائش نہیں۔ اب ایسا انداز اختیار کرنے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں یا تو یہ کہ اللہ کو کوئی حکم دینے میں تامل ہو (نعوذ باللہ من ذالک) ظاہر ہے کہ ایسا تصور کرنا بھی کفر ہے یا یہ صورت ہو کہ اس کا کوئی حکم حتمی نہ ہو تو اس میں تبدیلی کی ضرورت پیش آتی ہے (فالعیاذ باللہ) تو صاف بات ہے کہ ایسا تصور کرنا بھی دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے کیونکہ وہ اللہ ہے ایسی باتوں سے پاک ہے جو نقص پر دلالت کرتی ہوں۔ اب یہی صورت باقی رہ جاتی ہے کہ محبوب ﷺ کی مشقت بھی گراں گزرتی ہے اس کی طبعیت کا بھی خیال ہے۔ لہذا اس انداز کا حکم ہوا۔

اب حضور ﷺ نے راتوں کا جاگنا تو کم کر دیا لیکن امت کی فکر کچھ اس طرح دامن گیر ہوئی کہ سوتے میں بھی امت کا غم لئے رہتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جبرئیل امین کو آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجا کہ میرا مقصد تو محبوب ﷺ کی طبیعت کا بوجھ ہلکا کرنا تھا مگر ایسا ابھی تک نہیں ہوا۔ لہٰذا تو میرے محبوب کو اس کی امت کی بخشش کا مژدہ جانفزا سنا دے۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًاO لا لِّیَغْفِرَلَکَ اللّٰہُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِکَ وَ مَا تَاَخَّرَ۔ (الفتح، ۴۸:۱۔۲)	بے شک ہم نے تمہیں کھلی فتح دے دیo تا کہ اللہ تمہارے سبب گناہ بخشے تمہارے اگلوں کے اور تمہارے پچھلوں کے۔

حضور ختمی مرتبت اولادِ آدم کے ہی نہیں تمام مخلوقات کے نجات دہندہ بن کر آئے تمام جہانوں کے لئے آپ کو رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ رسولِ محتشم ﷺ امت کے غم میں رات رات بھر جاگتے جب خدائے رحیم و کریم کی طرف سے امت کی بخشش کی بشارت مل گئی تو (اس خیال سے کہ امت اپنے گناہوں کی بخشش پر کما حقہ ہوا اپنے رب کا شکر ادا نہ کر پائے گی) راتیں سجدوں کی تابانی سے پھر منور رہنے لگیں صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ اب تو امت کی بخشش کا سامان بھی ہو گیا اب تو آپ راتوں کو نہ جاگا کریں، ارشاد گرامی ہوا۔

أفلا أكون عبداً شكوراً۔ (صحیح البخاری، ۲:۷۱۶، کتاب التفسیر، رقم: ۴۵۵۶)	کیا میں اپنے اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

مگر اللہ کو اپنے محبوب ﷺ کا مشقت میں پڑنا کیسے پسند آ سکتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

طٰهٰO مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓیO (طٰہٰ، ۲۰:۱۔۲)	طٰہٰ (اے محبوب مکرم) ہم نے آپ پر قرآن (اس لئے) نازل نہیں فرمایا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۔

انمول تحفے

قاعدہ ہے کہ جانے والا جب کسی کے گھر جائے تو کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لے کر جاتا ہے۔ سو حضور ﷺ بھی قاب قوسین سے بھی زیادہ قرب پر فائز ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تین تحفے پیش کئے۔ عرض کیا۔

التحیات لِلّٰه والصلوات والطیبات	میری تمام قولی، مالی اور بدنی عبادتیں اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہیں (صرف اللہ کے لئے ہیں)
(معارج النبوۃ، ۳:۱۴۹)	

جواب میں حسبِ قاعدہ اللہ تعالیٰ نے بھی تین تحفے پیش کئے فرمایا۔

السلام علیک أیها النبی و رحمة الله و برکاته۔	محبوب ﷺ! تیرے لئے سلامتی، اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں (بطور تحفہ) ہیں۔
(معارج النبوۃ، ۳:۱۴۹)	

حضور ﷺ نے انہیں قبول فرمایا۔ مگر ساتھ ہی اپنی اس سلامتی میں اپنی امت کے گناہ گار لوگوں کو (اپنے ساتھ ملا کر) نیز نیکو کاروں کو بھی شامل کیا۔ عرض کیا۔

السلام علینا و علی عباد الله الصالحین ۔	سلامتی ہو ہم پر (یعنی میرے ساتھ میری امت کے گناہ گاروں پر بھی) اور اللہ کے نیک بندوں پر۔
(معارج النبوۃ، ۳:۱۴۹)	

جب اتنی گفتگو ہو چکی ملائکہ بھی پکار اٹھے

أشهد أن لا اله الا الله و أشهد أن محمدا عبده و رسوله۔	میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔
(معارج النبوۃ، ۳:۱۴۹)	

فرشتوں کی اس تصدیق کے بیان کے بعد کہ معراج حق ہے اوران تحائف کا لینا دینا بھی حق ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جب تم السلام علیک ایھا النبی پر پہنچو تو یہ تصور کرو۔

واحضر قلبک النبیﷺ و شخصه الکریم و قل السلام علیک ایھا النبی و رحمه الله و برکاته	اپنے دل میں نبی اکرمﷺ کو جلوہ گر سمجھو اور کہو اے اللہ کے نبی! آپ پر سلامتی اور اللہ کی رحمتیں ہوں اور اس کی برکتیں ہوں۔

(احیاء العلوم، ۱:۱۶۹)

جب اللہ تعالیٰ نے یہ دیکھا کہ حضور نبی کریمﷺ امت کے فکر اور غم میں راتوں کو بھی نہیں سوتے تو امت کے متعلق خوشخبری سنانے کے لئے اپنے پیارے محبوب کو اپنے پاس معراج کی صورت میں بلایا اور امت کے لئے عام معافی کی خوشخبری بھی سنائی اور شب معراج حضورﷺ کو اپنا دیدار بھی کروایا۔

باب پنجم

قرآن
اور
معجزہ معراجِ مصطفیٰ ﷺ

اَر بابِ عشق، صحیفۂ اِنقلاب قرآنِ حکیم فرقانِ حمید کو حضور ﷺ کی نعتِ مسلسل سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اِس لئے کہ ورق ورق پر محامدِ سرکار ﷺ کی دھنک بکھری ہوئی ہے۔ سطر سطر میں محاسنِ مصطفیٰ ﷺ کی قِندیلیں روشن ہیں اور ہر حاشیہ خوشبوئے اِسمِ محمد ﷺ سے مہک رہا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک نازِل ہونے والے تمام صحیفے بھی ذکرِ حضور ﷺ کے اَنوارِ سرمدی سے تابندہ ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ جلیل القدر ہستیاں نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تشریف آوری کا اِہتمام فرما رہی ہیں، جیسے کائنات کا ذرّہ ذرّہ تاجدارِ کائنات ﷺ کی قدم بوسی کے لئے بیتاب و مضطرب ہے، جیسے کارکنانِ قضا و قدر صبحِ مِیلاد کی پُرنور ساعتوں کی پذیرائی اور رسولوں کے لئے گویا اِعتبار کی سند جاری ہوتی ہے۔ مُعجزہ برہانِ نبوّت و رِسالت ہے، رُشد و ہدایت میں نعتِ حضور ﷺ کا باب اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک قرآن اور مُعجزاتِ حضور ﷺ کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے منصبِ رِسالت کے گرد عظمتوں اور رِفعتوں کے نورانی ہالے کا اِدراک اور شعور حاصل نہ کیا جائے۔ شعوری سطح پر عظمتِ رسول کا اِدراک ذہنِ اِنسانی میں اُبھرنے والے اَن گنت سوالات کا بھی جواب ہوتا ہے۔ اِسی سرچشمۂ شعور سے اِیمان و اِیقان کے سُوتے پھوٹتے ہیں اور صراطِ مستقیم پر گامزن مسافرانِ راہِ حق قربِ اِلٰہی کی منزل سے ہمکنار ہوتے ہیں اور توحید کے پرچم فرد کے ظاہر ہی میں نہیں اُس کے باطن میں بھی لہرانے لگتے ہیں۔

قرآن اور ذکرِ مصطفیٰ ﷺ میں دُوئی کا کوئی تصوّر نہیں۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ قرآن ذکرِ مصطفیٰ ﷺ سے خالی نہیں اور زبانِ مصطفیٰ ﷺ ذکرِ قرآن سے مملو ہے۔ قرآن کا اُسلوبِ عشق عجب پُر بہار ہے۔ قرآن کبھی تاجدارِ کائنات ﷺ کی نبوّت و رِسالت کا اِعلان کرتا ہے، کبھی کفار و مُشرکین کو آپ ﷺ پر اِیمان لانے کی ہدایت فرماتا ہے، کبھی آمنہ کے لال ﷺ کو وَالضُّحٰی کے پیار بھرے لقب سے پکارتا ہے اور کبھی طٰہٰ کے محبت آمیز خطاب سے یاد کرتا ہے۔ قرآن میں کبھی حضور ﷺ کی عنبریں زُلفوں کا ذِکر چھیڑتا ہے تو کبھی اِحترامِ رسول کا تذکرہ ہوتا ہے۔ قرآن کبھی آپ کی اِطاعت پر زور دیتا ہے اور کبھی آقائے دوجہاں ﷺ کی عظمتوں کا بیان ہوتا ہے۔ کبھی آپ کے جود و سخا کی بات، کبھی آپ کے دستِ عطا کا ذِکر، کبھی حضور ﷺ کی رضا کی باتیں، کبھی شہرِ مکہ کی قسمیں کہ محبوب ﷺ اِس شہر کو تیری قدم بوسی کا اعزاز حاصل ہوا۔ قرآن کبھی محبتِ اِلٰہی کے لئے اِتباعِ مصطفیٰ ﷺ کو مشروط قرار دیتا ہے اور کبھی اِطاعتِ مصطفیٰ ﷺ ہی کو اِطاعتِ اِلٰہی ٹھہراتا ہے۔ کبھی قرآن اللہ اور اُس کے محبوب رسول ﷺ کے کلام کے درمیان وحدت قائم کرتا ہے۔ اِیمان، اِطاعت، مَعصیت، مخالفت، عداوت، حرّیت، جہاد، رضا، غنا، فقر، عطا، نِدا، برأت، رُجوع، اِنعام، فیصلہ غرضیکہ اِن تمام چیزوں کو جس طرح اللہ تبارک و تعالٰی کی ذاتِ لاشریک کے لئے ثابت کرتا ہے، اُسی طرح حضور رحمتِ عالم ﷺ کی ذاتِ اَقدس کے لئے بھی ثابت کرتا ہے۔ یہی قرآن کبھی مؤمنین کو حضور ﷺ کی عزت و اِحترام کی بجا آوری کا سبق دیتا ہے اور کبھی بعثت سے قبل آپ کی عمرِ مبارک کو دلیلِ توحید بناتا ہے۔ کبھی اپنے رسول کے درِ عطا پر جھکنے ہی کو اِیمانِ کامِل سے تعبیر کرتا ہے اور کبھی زبانِ اَقدس سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو وحیٔ اِلٰہی قرار دیتا ہے۔ کبھی آپ ﷺ کے دستِ حق پرست پر کی جانے

والی بیعت کو بیعتِ اِلٰہی گردانتا ہے تو، کبھی حضور ﷺ کے پتھر مارنے کو اپنی ذات کی طرف منسوب کرتا ہے کہ اَے محبوب! یہ پتھر آپ نے نہیں ہم نے مارے تھے۔ قرآن ہر لحظہ چراغِ مدحتِ رسول ﷺ جلائے رکھتا ہے۔ کہیں حضور ﷺ کی فضیلت بیان ہو رہی ہے اور کہیں آپ ﷺ کی مِثلیت کا تذکرہ ہو رہا ہے، کبھی آپ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کو رُشد و ہدایت کا دائمی سرچشمہ قرار دیا جا رہا ہے اور کبھی آپ ﷺ کی ذاتِ مُطہّرہ کو مؤمنوں کے حق میں جان سے بھی بڑھ کر عزیز بتایا جا رہا ہے۔ قرآن کبھی اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی محبت کو تمام محبتوں پر مُقدّم سمجھنے کی نصیحت کرتا ہے اور کبھی حضور ﷺ کی مجلس میں بیٹھنے والوں کو آدابِ رسالت سے آگاہ کرتا ہے، کبھی اُنہیں محفلِ حضور ﷺ میں بات کرنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ قرآن کہیں آپ ﷺ کے لائے ہوئے دِین کے غلبے کا ذِکر فرماتا ہے اور کبھی حضور ﷺ کی اِطاعت میں ہدایت کی ضمانت دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اِطاعتِ رسول ﷺ اِنعامِ اِلٰہی ہے۔ آپ کو کُل جہانوں کے لئے رحمت بنا کر مَبعوث فرمایا گیا۔ کبھی ربِّ کائنات کتابِ مُبیں میں فرماتا ہے کہ میں اور میرے فرشتے حضور نبیٔ رحمت ﷺ پر دُرود بھیجتے ہیں اور پھر اَہلِ اِیمان کو حکم دیتا ہے کہ تم بھی آقائے رحیم و کریم پر کثرت سے دُرود و سلام بھیجا کرو۔ کبھی حضور ﷺ کی عظمت و رِفعت اور شانِ رِسالت کا اِظہار یوں ہوتا ہے کہ اَے حبیب ﷺ! آپ کی رِسالت تمام عالمِ اِنسانیت کے لئے ہے۔ کبھی یہ مژدۂ جانفزا سنایا جاتا ہے کہ یا محمد ﷺ! آپ کی ہر آنے والی گھڑی پہلی سے بہتر ہوگی اور ترقئ درجات کا باعث ہوگی۔ قرآن کبھی رسول ﷺ کے علمِ ما کان و ما یکون کی خبر دیتا ہے۔ یہی قرآن کبھی گنہگاروں کے لئے آپ کی ذاتِ اَقدس کو پناہ قرار دیتا ہے اور آپ ﷺ کی سفارش ہی کو اللہ کی معافی کا باعث گردانتا ہے۔ کہیں آپ کی ذاتِ اَقدس کو چمکتے ہوئے ستارے والنجم کے

دِلرُبا لقب سے پکارا جاتا ہے تو کہیں خدائے ذُوالجلال خود آپ ﷺ کی عمرِ مُبارک کی قسم کھاتا ہے۔ خالقِ کائنات قرآن میں جب دیگر نبیوں اور رسولوں کا ذِکر کرتا ہے تو اُن کے اَسمائے گرامی لے کر ندا کرتا ہے مگر جب رسولِ آخرالزّماں ﷺ سے خِطاب کرتا ہے تو اپنے محبوب ﷺ کو مختلف اَلقابات سے یاد کرتا ہے۔ کبھی آپ ﷺ کی چشمانِ مُقدّس کی قسم کھاتا ہے۔ کبھی آپ ﷺ کے قلبِ اَطہر کی کیفیّات کو موضوعِ سخن بناتا ہے، کبھی حضور ﷺ کے حسنِ خُلق کے چرچے فرماتا ہے تو کبھی ساری اُمتوں پر تاجدارِ کائنات ﷺ کو گواہ اور نگہبان بنانے کی بات کرتا ہے۔ کبھی عالمِ اَرواح میں اَرواحِ اَنبیاء علیہم السلام کو جمع کر کے ربِّ کائنات اُن سے اپنے محبوب ﷺ کی مدد و نصرت کا عہد و پیمان لیتا ہے، کبھی مقامِ محمود پر فائز کئے جانے کا ذکرِ دِلنواز کرتا ہے۔ کبھی آپ ﷺ کو توسُّل و شفاعت کا پرچم عطا کرتا ہے اور کبھی آپ ﷺ کو غیب کے خزانوں کی کُنجیاں عنایت فرماتا ہے۔ قرآن کا یہ اُسلوبِ تحسین دِلکش ہی نہیں عظمت کی بلندیوں کا بھی آئینہ دار ہے۔

ہر سمت ہے محامدِ سرکار ﷺ کی دَھنک

ربِّ کائنات نے قرآن کے ورق ورق پر نبیِٔ آخرالزّماں حضرت محمد ﷺ کے محاسن بیان کئے ہیں۔ ہر طرف محامدِ سرکار ﷺ کی دَھنک پُرفشاں ہے۔ قرآن مُعجزاتِ حضور ﷺ کے تذکارِ جمیلہ کی چاندنی سے بھی جگمگا رہا ہے۔ مُعجزاتِ رسول عالمین ﷺ کے باب میں خود قرآن بھی آپ ﷺ کا ایک دائمی اور اَبدی مُعجزہ ہے۔ آپ ﷺ کی ذاتِ اَقدس بھی دلیلِ توحید ہونے کی وجہ سے ایک زِندہ و تابندہ مُعجزہ ہے اور اس حیاتِ مُقدّسہ کا ایک ایک لمحہ جوازِ صبحِ نو بہار ہے۔ قرآن جب حضور ﷺ کے مُعجزۂ مِعراج کا ذِکر کرتا ہے اور عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کے پرچم لامکاں کی وُسعتوں میں

دِکھائی دیتے ہیں۔ عقلِ اِنسانی تصویرِ حیرت بن جاتی ہے۔ ہمارے آقا ﷺ لامکاں تک پہنچتے ہیں اور باری تعالیٰ کا بے حجاب دِیدار کرتے ہیں۔ اِنعامات و اِکرامات کے ساتھ واپس لوٹتے ہیں۔ کہیں قرآن حضور ﷺ کے شقِ صدر کے مُعجزے کا ذِکر کرتا ہے۔ حضور نبیٔ اکرم ﷺ کی شانِ اُمیّت بھی آپ کا مُعجزہ ہے۔ حضور ﷺ کی ذاتِ اَقدس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے کفار و مُشرکین کی طرف سے اپنی پناہ میں لے لیا۔ جنّات کا حضور ﷺ کے دستِ اَقدس پر اِسلام قبول کرنا اور غزوۂ بدر میں فرشتوں کا قِطار اندر قِطار اُترنا بھی حضور ﷺ کے مُعجزاتِ جلیلہ میں سے ہے۔

فصل اول:

سورۃ اسراء کی روشنی میں واقعہ معراج

تاریخِ اِرتقائے نسلِ اِنسانی میں مُعجزۂ معراج ایک بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا سنگ میل ہے جسے بوسہ دیئے بغیر اِرتقاء کی کوئی منزل طے نہیں ہوسکتی۔ عروجِ آدمِ خاکی کا کوئی خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ سفرِ معراج دراصل سفرِ اِرتقاء ہے۔ یہ حضور ﷺ کا وہ عظیم مُعجزہ ہے جس پر اِنسانی عقل آج بھی اَنگشت بدنداں ہے۔ اِنتہائی قلیل وقت میں مسجدِ حرام سے بیت المقدس تک کی طویل مسافت طے ہو جاتی ہے۔ قرآن اِس کا ذکر اِن اَلفاظ میں کرتا ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ○

(بنی اِسرائیل، ۱۷:۱)

وہ ذات (ہر نقص اور کمزوری سے) پاک ہے جو رات کے تھوڑے سے حصہ میں اپنے (محبوب اور مقرّب) بندے کو مسجدِ حرام سے (اُس) مسجدِ اَقصیٰ تک لے گئی جس کے گرد و نواح کو ہم نے بابرکت بنا دیا ہے تاکہ ہم اُس (بندۂ کامل) کو اپنی نشانیاں دِکھائیں۔ بیشک وُہی خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے○

اِس آیتِ مقدّسہ پر غور و تدبر کریں تو شکوک و شبہات کے تمام راستے خود بخود مُقفّل ہو جاتے ہیں، کسی اِلتباس کی گنجائش رہتی ہے اور نہ کسی اِبہام کا جواز باقی

رہتا ہے۔ عقلی اور نقلی سوالات آنِ واحد میں ختم ہو جاتے ہیں۔ مسئلہ کا ہر پہلو روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے اور حقیقت اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ ذہنِ اِنسانی پر مُنکشف ہو جاتی ہے۔ اِیمان میں مزید اِستحکام پیدا ہوتا ہے، اِیقان کو مزید پختگی نصیب ہوتی ہے، نصِ قرآن سے بڑھ کر تو کوئی رِوایت نہیں ہوسکتی۔ جب باری تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ میں اپنے بندے کو رات کے ایک قلیل عرصے میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اَقصیٰ تک لے گیا۔ اِس پر بھی عقلِ اِنسانی اِستعجاب کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ذہنِ اِنسانی میں سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ وہ سفر جو ہفتوں اور مہینوں کا تھا، وہ رات کے ایک تھوڑے سے وقت میں کیسے مکمل ہوسکتا ہے؟ اِس کا جواب یہی ہے کہ اِس کا اِنحصار تو لے جانے والے کی طاقت اور قوّت پر ہے۔ اُس سفر کا سارا اِنتظام ربِّ کائنات کی طرف سے ہو رہا ہے، وہ جو ہر چیز پر قادِر ہے۔ طاقت اور قُدرت اُس ذات کی کارفرما ہے جو اِس کائنات کا خالق و مالک ہے، کائنات کا ذرّہ ذرّہ جس کے حکم کا پابند ہے۔ وہ ربّ جو إِنَّ اللهَ عَلٰى كُلِّ شَيءٍ قَدِيْرٌ کا مالک ہے۔ وہ ربّ جو اَمرِ كُنْ فَيَكُوْنَ کی طاقت رکھتا ہے اور اُس کے لئے کوئی چیز ناممکن اور محال نہیں۔ اِنسانی عقل اُس کی قُدرتِ مُطلقہ کے ساتھ بے بس اور عاجز ہے۔ اگر یہ نکتہ ذِہن نشین کر لیا جائے تو سفرِ مِعراج کی ساری حقیقت عیاں ہو جاتی ہے۔ جبرئیلِ اَمین کو اُس نے بھیجا کہ جاؤ! میرے محبوب ﷺ کو لے آؤ۔ برّاق اور رفرف بھی مِن جانبِ اللہ بھیجے گئے۔ حضور ﷺ نے یہ سماوِی سفر کس رفتار سے طے کیا اور کیسے کیا، زمان و مکان کی قیودات سفرِ مِعراج پر اَثر اَنداز ہوئیں یا نہ ہوئیں، کیا برّاق اور رفرف کی رفتار روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ تھی؟ اِن تمام سوالات کے جوابات لفظِ ’’سُبْحٰنَ الَّذِیْ‘‘ میں مضمر ہیں۔

قُدسیوں نے یہ سرِ عرش منادی کر دی
سیدہ آمنہؓ کا ماہِ تمام آتا ہے
مُستند جس کا ہر اِک نقشِ قدم ہونا ہے
آج کی شب وہ رسولوں کا اِمام آتا ہے

لفظِ ''سُبُحَان'' کے معارف وحکم

لفظِ سُبُحَان، پاکیزگی اور تقدیس کے معنوں میں اِستعمال ہوتا ہے۔قرآنِ حکیم علم، حِکمت اور دانائی کی آخری آسمانی دستاویز ہے۔ یہ لفظ اپنے اَندر معانی کا ایک سمندر لئے ہوئے ہے۔ اِس کے اِستعمال میں اَن گنت حکمتیں پوشیدہ ہیں۔اُن میں سے بعض ضروری حِکمتوں کا بیان ذیل میں کیا جاتا ہے تاکہ اِس آیتِ مقدّسہ کا مفہوم اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ ذہنِ اِنسانی میں روشن ہو سکے۔

پہلی حِکمت

روزمرّہ زِندگی میں ہم یہ مُشاہدہ کرتے ہیں کہ عام تحریر کا اُسلوب یہ ہے کہ جب کسی شخص کی کوئی خاص فضیلت یا اُس کا کوئی خاص وصف بیان کیا جانا مقصود ہو تو حرفِ آغاز میں اُسی کا نام لیا جاتا ہے۔ اِس اُصول اور ضابطے کے مطابق آیتِ مذکورہ کا آغاز نبیِٔ آخرالزّماں حضرت محمد ﷺ کے اِسمِ گرامی سے ہونا چاہئے تھا لیکن پروردگارِ عالم نے اپنے ذِکر سے اِس آیت کا آغاز فرما کر اِنسان کو غور و فکر اور تدبر کی دعوت دی ہے، اِس لئے کہ وہ خالقِ کائنات ہے اور اُس کی ذاتِ لاشریک ہر قسم کے وہم و گمان سے بالاتر اور ہر قسم کے نقص و عیب سے اِس قدر پاک ہے کہ اِنسانی ذِہن میں اُس کا تصوّر بھی محال ہے۔ اللہ ربّ العزّت نے سلسلۂ اَنبیاء کے آخری رسول جناب رسالت

مآب ﷺ کو اپنی محبوبیت کی خِلعتِ فاخرہ عطا کی، اَنوار و تجلیات کے جلو میں آپ کو منصبِ رسالت سے نوازا، اُس کا لطف و کرم ہر لحہ شاملِ حال رہا، ہر لحہ اُس نے اپنے محبوب کی دستگیری فرمائی اور ہر طرح سے نبیٔ رحمت ﷺ کی دِلجوئی کی۔ معراج اُن نوازشاتِ پیہم کی نسبت عظیم تر نعمت تھی اور عظیم تر اِحسان تھا۔ خدائے علیم و خبیر کے علم میں تھا کہ کفار و مُشرکین واقعۂ معراج کو بھی تسلیم کرنے سے اِنکار کر دیں گے کیونکہ اِس عظیم سفر کا ہر ہر پہلو حضور رحمتِ عالم ﷺ کی عظمتوں اور رِفعتوں کا آئینہ دار ہے۔ مُشرکینِ مکہ جو پہلے ہی اِسلام اور پیغمبرِ اِسلام ﷺ کے خلاف سازشوں کا جال بچھا رہے تھے، حضور ﷺ کی عظمت و رِفعت کی بات کو وہ کیسے قبول کریں گے! دستورِ زمانہ ہے کہ جو شخص پسند نہ ہو اُس کے حسن و جمال کا کوئی پہلو بھی گوارا نہیں کیا جاتا بلکہ کمالات کو بھی تضحیک و تحقیر کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور حقیقت کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ کر بھی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ کفار و مُشرکین کا یہی رویہ اللہ کے نبی کے ساتھ تھا۔ وہ حضور ﷺ کو صادق و اَمین تسلیم کرنے کے باوجود آپ ﷺ کی تعلیماتِ مقدّسہ کا تمسخر اُڑانے میں مصروف تھے۔ اِس کے برعکس اپنی کسی محبوب شخصیت کے عیوب بھی وجہِ کمال بن کر نظر آتے ہیں اور محبوب کے حسن و جمال کی تعریفوں میں مُبالغہ آرائی کی اِنتہا کر دی جاتی ہے، خواہ محبوب کے یہ اَوصاف معمولی سے ہی کیوں نہ ہوں۔

ربِّ کائنات کے علم میں تھا کہ مکہ میں بسنے والا ہر شخص اَبوبکر صدیقؓ نہیں، ہر شخص عمر فاروقؓ کی آنکھ نہیں رکھتا، ہر شخص عثمانؓ جیسا اَہلِ اِیمان نہیں، ہر شخص علیٔ مرتضیٰؓ جیسا جاں نثار نہیں۔ یہاں اَیسے بدبخت اور بدطینت بھی موجود ہیں جو حضور پُرنور کو اَبوجہل کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ اِسی طرح اَہلِ مکہ میں آپ کے حاسِد بھی ہوں گے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کو یہ گوارا نہیں تھا کہ اُس نے مُعجزۂ معراج سے اپنے حبیب ﷺ کو جن

عظمتوں اور رِفعتوں سے ہمکنار کیا ہے، کفار و مُشرکین اپنے تمام تر حسد کے باوجود اُس پر اُنگلی اُٹھا سکیں۔ اللہ ربّ العزّت کی منشاء یہ تھی کہ حاسِدین اور مُنکرین بھی اس پر اعتراض نہ کرسکیں۔ اِس لئے آیتِ مذکورہ کا آغاز اَپنے نام سے کیا کیونکہ کفار و مُشرکین کسی نہ کسی صورت میں خدائے واحد کا تصوّر رکھتے تھے۔ فرمایا کہ وہ ذات جس نے اپنے حبیب ﷺ کو مِعراج کی نعمت سے سرفراز فرمایا، وہ ذات جو نقص اور عیب سے پاک ہے، جس کی کوئی اِبتدا ہے اور نہ کوئی اِنتہاء، وہ ذات جسے جو چاہتی ہے عطا کرتی ہے۔ اِس ساری بحث کو اِن اَلفاظ میں سمیٹا جا سکتا ہے گویا ذاتِ باری تعالیٰ کہنا یہ چاہتی ہے کہ جو سفرِ معراج کا مُنکر ہے وہ اللہ کی قُدرتِ کاملہ کا مُنکر ہے۔ گویا یہ اللہ کے خلاف اِعلانِ جنگ ہے اور اُس سے پوچھیئے کہ تو نے یتیمِ عبداللہ کو اِتنی بڑی نعمت کیوں عطا کی! یہ کتنی بڑی حِکمت ہے کہ مِعراج کا دعویٰ حضور ﷺ فرما ہی نہیں رہے۔ دعویٰ تو خود اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے۔ گویا مِعراج کا اِنکار اللہ ربّ العزّت کی قُدرتِ کاملہ کا اِنکار ہے۔ آیتِ مذکورہ میں وُہی اُسلوب اِختیار کیا گیا ہے جو خدائے بزرگ و برتر نے اپنے محبوب رسول ﷺ کی دِلجوئی کے لئے قرآن میں مختلف مقامات پر اِختیار کیا ہے کہ اپنے محبوب ﷺ کی دستگیری بھی فرمائی اور دُشمنانِ اِسلام کے ناپاک منصوبوں پر اُنہیں وعید بھی سنائی۔

ایک دفعہ چند روز کے لئے وحی کا نزول بند ہوگیا تو کفار و مُشرکین نے اُس بندش کو اُچھالتے ہوئے طعن و تشنیع کی بارِش کر دی کہ محمد ﷺ کے ربّ نے محمد ﷺ سے منہ موڑ لیا ہے۔ وہ حضور ﷺ سے ناراض ہوگیا ہے۔ اِس پر اِرشاد ہوا:

مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰیO
(الضحیٰ، ۹۳:۳)

آپ کے ربّ نے (جب سے آپ کو مُنتخب فرمایا ہے) آپ کو نہیں چھوڑا اور نہ ہی (جب سے آپ کو محبوب بنایا ہے) ناراض ہوا ہےO

بعض اُجڈ، گنوار اور جاہل دیہاتی حضور رحمتِ عالم ﷺ کے اِسمِ گرامی کو بگاڑ کر اَدا کرتے اور اپنے طور پر تضحیک و تحقیر کا پہلو نکالتے۔ اُن جہلاء کو آپ ﷺ کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا بلکہ دفاعِ مصطفیٰ ﷺ میں خود ربُّ العالمین نے فرمایا:

عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِکَ زَنِیْمٍO (القلم، ۶۸:۱۳)

(وہ شخص) سرکش ہے اور پھر یہ کہ اُس کی اَصل بھی خراب ہے (یعنی حلال زادہ نہیں)o

ایک اور مقام پر اللہ ربّ العزّت کی طرف سے اپنے جلیل القدر نبی اور رسول کا دِفاع اِن اَلفاظ میں کیا جا رہا ہے:

تَبَّتْ یَدَا أَبِیْ لَهَبٍ وَّ تَبَّO (اللھب، ۱۱۱:۱)

اَبولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ تباہ ہو جائے (اُس نے ہمارے حبیب ﷺ پر ہاتھ اُٹھانے کی کوشش کی ہے)o

وہ ذاتِ لاشریک خود فرما رہی ہے کہ اَبولہب! تو میرے نبی ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش رہتا ہے، تو آمنہ کے لال کی راہ میں کانٹے بچھاتا ہے، تو میرے رسول ﷺ کے خِلاف سازشوں کے جال بُنتا ہے، تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔

سُبْحَان کا لفظ اِس اَمر پر دلالت کرتا ہے کہ ربِّ کائنات تمہارے ہر اِعتراض سے پاک ہے۔ گویا اللہ ربُّ العزّت کفار و مُشرکین کو خبردار کر رہے ہیں کہ ہم نے اپنے بندے اور رسول کو عظمتِ معراج سے نوازا ہے اور عالمِ بیداری میں رسولِ معظم ﷺ کو پیکرِ بشری کے ساتھ آسمانوں کی سیر کرائی ہے۔ حضور ﷺ کی اِس عظمت کا اِنکار کرنا اور نہ اِس پر کوئی اِعتراض کرنا کہ یہ دعویٰ کرنے والے خود ہم ہیں اور ہماری

ذات عیب و نقص سے پاک ہے۔

دُوسری حِکمت

لفظ سُبْحَان سے آیتِ مقدسہ کا آغاز کرنے میں ایک حِکمت یہ بھی پوشیدہ ہے کہ معترض اور مُنکر واقعۂ معراج کو عقلِ ناقص کی کسوٹی پر پرکھنے کی حماقت نہ کرے۔ وہ ظاہر کی آنکھ سے نہیں قلب کی چشمِ بینا سے ربّ ُالعالمین کی قُدرتِ مُطلقہ کا مُشاہدہ کرے۔ سفرِ معراج ایک مُعجزہ ہے اور مُعجزہ ہوتا ہی وہ ہے جو عقلِ اِنسانی کو عاجز اور بے بس کر دے۔ یہ تو اُس ذاتِ پاک کی قُدرتوں کا کرِشمہ ہے جو خود بھی عقلِ ناقص کے دائرۂ پرواز سے باہر ہے۔ اِرشاد ہوتا ہے:

سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَO (المؤمنون، ۹۱:۲۳)

اللہ اُن باتوں سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیںo

دعویٰ اُسی کا ہے جو ربِّ کائنات ہے اور کائنات کی ہر چیز جس کے حکم کی پابند ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ ہم نے اَپنے محبوب ﷺ کو آسمانوں کی سیر کرائی...... اِس لئے مادّی دُنیا کے قواعد و ضوابط کا اِطلاق نبیوں اور رسولوں کے مُعجزات پر نہیں ہوتا کیونکہ اُس کی قُدرتِ کاملہ کا کلی اِدراک عقلِ اِنسانی کے بس کی بات ہی نہیں۔ پاسبانِ عقل کا دِل کے ساتھ رہنا دُرست ہی سہی لیکن کبھی کبھی دِل کو تنہا بھی چھوڑ دینا چاہیئے۔ عشق کے کسی معاملے کی توجیہہ عقل سے ممکن ہی نہیں، اِس لئے واقعۂ معراج کو بھی اُسی تناظر میں دیکھنا چاہیئے کہ یہ کرمِ خدائے وحدہٗ لاشریک کا کرم ہے، جس کی بارگاہ میں لب کشائی کا تصوّر بھی کفر ہے۔

تیسری حِکمت

جب کوئی کام ہماری پہنچ یا دسترس سے باہر ہوتا ہے تو عموماً خیال کر لیا جاتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اِنسان کی قوّت اور اُس کا دائرۂ عمل محدود ہے۔ کارخانۂ قُدرت میں اُسے ایک معمولی سی اِکائی کی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں لفظِ سُبْحَان اِستعمال کر کے اللہ ربُّ العزّت نے مُنکرین کا منہ بند کر دیا ہے کہ یہ اَمر عقل کے حیطۂ اِدراک میں آ ہی نہیں سکتا۔ عقل یہ تسلیم نہیں کرتی کہ کوئی شخص اَپنے جسدِ خاکی کے ساتھ بیداری کی حالت میں حرمِ کعبہ سے مسجدِ اَقصیٰ تک کا سفر طے کرے اور پھر لامکاں کی وُسعتوں کو چیرتا ہوا قَابَ قَوْسَیْن کی بلندیوں پر جلوہ اَفروز ہو اور آنِ واحد میں زمین پر واپس بھی آ جائے۔ عقل ناقص ہے اور اِنسان کمزور و ناتواں، وہ کسی چیز کو ردّ کرنے یا اُسے تسلیم کرنے میں اپنی ناقص صلاحیتوں کا سہارا لیتا ہے۔ اِس سے آگے کا سوچنا اُس کی عقلِ ناقص کے دائرۂ عمل میں نہیں آتا، اِس لئے ذہنِ اِنسانی میں شکوک و شبہات کی گرد اُٹھتی ہے اور غبارِ تشکیک اُس کی سوچوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے لیکن ربِّ کائنات کی ذات لامحدود ہے۔ مشیتِ اَیزدی جو چاہتی ہے ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ ناممکن یا محال کے لفظ کا اِطلاق اللہ ربُّ العزت کی قُدرتِ کاملہ پر ہوتا ہی نہیں۔ وہ قادرِ مُطلق ہے اور ہر چیز پر قادِر ہے۔ سفرِ معراج بھی اُسی کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔

چوتھی حِکمت

تاریخِ اَنبیاء میں جابجا مُعجزات کا ذِکر ملتا ہے۔ خرقِ عادت واقعات جن پر عقلِ اِنسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ لفظِ سُبْحَان کے اِستعمال میں یہ حِکمت بھی پوشیدہ ہے کہ مُنکرین کو یہ باوَر کرا دِیا جائے کہ اُسے اپنی عقلِ ناقص کے پیمانے پر نہ پرکھیں۔

مِعراج ایک مُعجزہ ہے اور مُعجزات کی مادّی توجیہہ بعض اَوقات اِنسان کو گمراہیوں کی دلدل میں لے جاتی ہے اور وہ صراطِ مُستقیم سے دُور ہونے لگتا ہے۔ ظاہری اَسباب کے بغیر رُونما ہونے والے واقعات اگر ہر کسی کی محدُود عقل کے دائرے میں سمانے لگیں تو پھر مُعجزہ مُعجزہ نہیں رہے گا۔

پانچویں حِکمت

جب ہم اپنی کسی محبوب ترین ہستی کا ذِکر کرتے ہیں تو اُس کی کسی اَدا پر سبحان اللہ کہہ کر اپنی محبت کا اِظہار کرتے ہیں۔ یہ حرفِ تحسین ہماری چاہت کا بھی آئینہ دار ہوتا ہے اور محبوب کے کمال کا مظہر بھی ہوتا ہے۔ والدین اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ بچہ اپنے قدموں پر چلنے کی کوشش کرے یا اپنی توتلی زبان سے کوئی لفظ اَدا کرے تو ماں باپ بے ساختہ سبحان اللہ کے حرفِ تحسین کے ساتھ بچے کی ننھی منھی اَداؤں پر اِظہارِ مسرّت و محبت کرتے ہیں۔ اِسی طرح حلقۂ اَحباب میں دوستوں کے کمالِ فن کا اِعتراف یہی لفظ اَدا کر کے کیا جاتا ہے۔ یہ کلمات ایک طرف اِظہارِ محبت پر دلالت کرتے ہیں تو دُوسری طرف اپنے محبوب کے حسن و جمال کے کسی پہلو کو سندِ جواز بھی عطا کرتے ہیں۔

حضور ﷺ محبوبِ کبریا ہیں، اَقلیمِ اَنبیاء کے آخری تاجدار ہیں، خدا کے بعد مخلوقات میں سے سب سے بزرگ و برتر، سفرِ معراج آپ جیسے جلیل القدر پیغمبر کے لئے بھی کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ یہ عظیم سعادت حاصل ہو رہی ہے تو قُدرتی طور پر دِل میں یہ خواہش کروٹیں لیتی ہے کہ کاش اِس موقع پر کوئی سبحان اللہ کہہ کر حصولِ عظمت کے اِس واقعہ کی پذیرائی کرے۔ یہ لفظ وُہی اَدا کر سکتا تھا جو عمر، علم، عمل اور عظمت میں

بڑا ہوتا۔ عمر میں بڑا ہونے کا اِعزاز آپ کے والدین کو حاصل تھا اور وہ اُس وقت دُنیا میں موجود نہ تھے اور جن شخصیتوں نے آپ کی پرورش کی وہ بھی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں، اِس لئے سبحان اللہ کہنے والا کوئی بڑا بظاہر موجود نہیں تھا۔ اَب ربِّ محمد ﷺ ہی یہ لفظ اَدا کر سکتا تھا کہ سب تعریفوں کے لائق وُہی ذاتِ وحدہٗ لاشریک ہے۔ گویا ربِّ کائنات نے اپنے سب سے بڑے شاہکار یعنی اپنے محبوب رسول ﷺ کے سفرِ معراج کے آغاز پر یوں فرمایا: ''اے محبوب ﷺ! یہ حرفِ تحسین اَدا کرنے کے لئے اگر کوئی اور موجود نہیں تو کیا ہوا۔ پیارے کمالِ شفقت اور محبت کے ساتھ یہ حرفِ محبت ہم اَدا کئے دیتے ہیں''۔

الَّذِیْ اور بِعَبْدِہٖ کے اَسرار و رُموز

لفظِ سُبْحَان کی تشریح و توضیح کے بعد اَب ہم آیتِ کریمہ کے اگلے اَلفاظ الَّذِیْ اور بِعَبْدِہٖ کے مفہوم کو متعین کرتے ہوئے اِن اَلفاظ کے اَسرار و رُموز اور اُن میں پوشیدہ حکمتوں کے بارے میں اِظہارِ خیال کریں گے۔

الَّذِیْ بمعنی ''وہ'' عربی لُغت اور اَدب کے اِعتبار سے اِسمِ موصول ہے۔ ضابطہ اور قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی ذات کا ذِکر مقصود ہو تو الَّذِیْ کا لفظ اِستعمال کیا جاتا ہے۔ عَبْد کا معنی بندہ ہے لیکن جب اِسے وسیع تر معنوں میں لیا جائے تو کائنات کی ہر ذِی شعور اور غیر ذِی شعور، ہر جاندار اور غیر جاندار گویا کائنات کی ہر شئے پر اِس لفظ کے مفہوم کا اِطلاق ہوگا، اِسی لئے کہا جاتا ہے کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنے خالق کی حمد بیان کر رہا ہے۔ گویا ہر چیز فریضۂ بندگی کی اَدائیگی میں مصروف ہے۔ اِس میں اِنسان، حیوان، چرند اور پرند حتی کہ بے جان اَجسام کی بھی کوئی تخصیص نہیں۔ اِرشادِ خداوندی ہے:

إِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ إِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًاO (مریم،۱۹:۹۳)	آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی (آباد) ہیں (خواہ وہ فرشتے ہیں یا جن و اِنس) وہ اللہ کے حضور محض بندہ کے طور پر حاضر ہونے والے ہیںo

اللہ ربّ العزّت نے سفرِ معراج کا ذِکر کرتے وقت اپنا نام لیا اور نہ اپنے محبوب کا...... اِشارے کِنائے میں بات کی ہے۔ قرآنِ مجید کا یہ اُسلوب اِظہار کی دِلکشی اور بیان کی رعنائیوں کا آئینہ دار ہے۔ ''پاک ہے وہ ذات (اللہ) جس نے سیر کرائی اپنے بندۂ خاص کو''۔ اِشارے اور کِنائے میں بات کرنا شدید محبت اور اَپنائیت کی علامت ہوتا ہے۔ گویا الَّذِیْ کہنے میں اُس کے چاہنے اور عَبْدِهٖ میں اُس کے چاہے جانے کی طرف اِشارہ ہے۔ الَّذِیْ اور عَبْدِهٖ میں بھی پوشیدہ حکمتوں سے علم و دانش کی پرتیں کھلتی ہیں۔ اَسرار و رُموز، حقائق کی روشنی میں آتے ہیں اور تفہیم کی بے شمار صورتیں صفحۂ قرطاس پر بکھر جاتی ہیں۔

۱- نہ کوئی زمیں پہ جواب ہے نہ فلک پہ کوئی مثال ہی

عربی زبان کے قواعد و ضوابط کے مطابق ''الَّذِیْ'' اور ''عَبْد'' کے اَلفاظ اپنے اِطلاق کے اِعتبار سے تخصیص کی بجائے عمومیت کے حامل ہیں، یعنی قادرِ مطلق کے علاوہ بھی کوئی شخص الَّذِیْ ہوسکتا ہے۔ دُوسری طرف تاجدارِ کائنات حضور رحمتِ عالم ﷺ کے علاوہ بھی کائنات کی ہر شئے عَبْد ہے۔ بالفاظِ دیگر ہر ذات، ہر وُجود الَّذِیْ تو ہے لیکن الَّذِیْ نقص اور عیب سے مبرّا نہیں، یعنی اُس میں عیب بھی ہوتا ہے، نقص بھی پایا جاتا ہے، اُس میں کمی اور کجی بھی ضرور ہوتی ہے۔ جبکہ یہ الَّذِیْ کامل الَّذِیْ ہے، اِس میں کوئی نقص ہے اور نہ کوئی عیب۔ یہ ہر قسم کی کمی اور کجی سے بھی پاک ہے۔ فرمایا پاک

ہے وہ الَّذِیْ ہر عیب، نقص، کمی اور کجی سے۔ اِسی طرح ہر شئے عَبْد ہے اور ہر عَبْد اپنی عبدیت میں ناقص اور عاجز ہے لیکن جس عَبْد کا ذِکرِ جمیل اِس آیتِ کریمہ میں ہورہا ہے وہ کوئی عام عَبْد نہیں ہے۔ یہ اُس رحیم و کریم خدا کا خاص عَبْد ہے جس عَبْد کی عبدیت پر اُسے ناز ہے۔ جس عَبْد کو اُس نے کل جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا، جس عَبْد کے سرِ اَقدس پر ختمِ نبوّت کا تاج سجایا، اُسے عظمتوں اور رِفعتوں سے ہمکنار کیا اور جسے مُعجزۂ معراج عطا کر کے آسمانوں کی سیر کرائی کہ پوری دنیا ورطۂ حیرت میں ڈُوب گئی۔ یہ رسول عبدیت میں کامل و اَکمل، کوئی نقص اور نہ کوئی عیب، کسی قسم کی کوئی کمی نہ کجی، اپنی عبدیت میں یکتا و تنہا۔ فرمایا کہ پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے خاص بندے کو، گویا اِشارے کِنائے میں بات اِس لئے کی تا کہ واضح ہو جائے۔ ایک ذات ربِّ کائنات کی ہے اور ایک رسولِ کائنات ﷺ کی...... وہ اُلوہیت میں یکتا تو یہ عبدیت میں یکتا...... اُس جیسا کوئی ربّ نہیں، وہ ربوبیت میں بے مثال و بے نظیر...... اِن جیسا کوئی عَبْد نہیں، یہ اپنی بندگی میں بے مثال و بے نظیر ہے۔

۲۔ حضور ﷺ کا بشری و تہذیبی وُجود سلامت رہا

معراجِ مصطفیٰ ﷺ اَصل میں معراجِ بندگی ہے۔ عظمتوں اور رِفعتوں کے اُس سفر میں اللہ ربُّ العزّت نے اپنے محبوب بندے اور رسول کو اَن گنت اِنعامات و اِعزازات سے نوازا۔ معراج اِتنا بڑا واقعہ ہے کہ اُس میں آقائے دو جہاں حضور رحمتِ عالم ﷺ مقامِ قَابَ قَوْسَیْن پر فائز کیا گیا۔ قُرب اپنی اُس اِنتہا کو پہنچا کہ ہمیں اُس کا اِدراک حاصل ہوسکتا ہے اور نہ شعور۔ فاصلے مٹتے چلے گئے، دُوریاں ختم ہوتی چلی گئیں، حجابات اُٹھتے چلے گئے لیکن اُس مقام پر پہنچ کر بھی بندہ بندہ ہی رہا۔ درجات کی اُس عظیم الشّان بلندی پر جلوہ اَفروز ہو کر بھی عاجزی و اِنکساری کا پیرہن اُس رسولِ

عظیمﷺ کے لئے باعثِ اِعزاز بنا رہا۔ کرۂ اَرضی پر واپسی ہوئی تو سیاحِ لامکاں حضور رحمتِ عالمﷺ کا بشری وتہذیبی وُجود سلامت تھا۔

۳۔ مقامِ بندگی دے کرنہ لوں شانِ خداوندی

کامل بندگی کی منزل مردِ مومن کی وہ آرزو ہے جس کے حصول کے لئے وہ اپنی زِندگی کا ہر لمحہ حکمِ خدا کے تابع کر لیتا ہے، اِس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ پروردگارِ عالم کی کامل بندگی اِیمان میں کامل ہوئے بغیر نہیں ملتی اور اِنسان اِیمان میں کامل اُس وقت ہوتا ہے جب وہ سرتاپا عشقِ اِلٰہی میں ڈُوب جاتا ہے۔ جب بندگی اُس کے سر کا تاج ٹھہرتی ہے اور اُس کا دِل توحیدِ اِلٰہی کا مرکز بن جاتا ہے۔ قرآنِ پاک میں اِرشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ۔
(البقرہ، ۲:۱۶۵)

اور جو لوگ اِیمان والے ہیں وہ (ہر ایک سے بڑھ کر) اللہ سے بہت ہی زیادہ محبت کرتے ہیں۔

اپنے ربّ سے ٹوٹ کر محبت کرنا ہی بلندئ درجات کا باعث بنتا ہے۔ توحید کا پرچم سینوں میں بھی لہرائے تو بات بنتی ہے۔ اِرشادِ ربانی ہے:

وَ اذْكُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَ تَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيْلاًO
(المزمل، ۷۳:۸)

اور آپ اپنے ربّ کے نام کا ذِکر کرتے رہیں اور (نماز میں) سب سے الگ ہوکر اُسی کے ہو رہیں۔

مقامِ بندگی کا حصول اُسی وقت ممکن ہے جب اِنسان ہر شئے سے منہ موڑ کر اپنے خالق سے لَو لگا لے۔ اَپنے دِل سے ہر کسی کی محبت کو نکال دے اور اپنے مولا سے رِشتہ جوڑ لے کہ اُس کی چوکھٹ بندے کی منزلِ مقصود ہے۔ اپنے مالکِ حقیقی کی بندگی کا

کیف ہر کیف پر محیط ہے۔ اِقبال نے کہا تھا:

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

بندے کو اگر مقامِ بندگی عطا ہو جائے تو پھر وہ ہر منصب سے بے نیاز ہو جاتا ہے، ہر چیز کو ہیچ گردانتا ہے، لہٰذا اَپنے عبد کو آسمانوں کی سیر کرانے اور اُسے عظمتوں اور رِفعتوں سے ہمکنار کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ جس بندے کو اِعزازِ معراج سے نوازا گیا وہ کوئی عام بندہ نہ تھا بلکہ وہ اللہ کا آخری رسول تھا، جو ہر شئے سے کٹ کر اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ رشتۂ بندگی کو اَپنی اِنتہاؤں تک لے جا چکا تھا۔ جو ساری ساری رات اللہ کے حضور قیام کرتا کہ پاؤں سُوجھ جاتے اور اُن میں وَرم آ جاتا لیکن مقامِ بندگی کی حلاوتوں میں کچھ اور اِضافہ ہو جاتا۔ کیف و مستی کی کیفیتوں میں دِل ڈُوب جاتا اور جبینِ اَقدس میں سجدوں کا سرُور سما جاتا، بندگی کا حسن خدا کو چاہنے سے ہی قائم رہتا ہے۔ گویا آسمانوں کا یہ سفرِ عظیم محض حسنِ اِتفاق نہ تھا بلکہ یہ سفر ایک چاہت کا سفر تھا۔ محبت و مؤدّت کا سفر تھا۔ عظمت و رِفعت کا سفر تھا۔ ایک آرزو کی تکمیل اور ایک خواہش کے اِتّمام کا سفر تھا۔ وہ سفر کہ جس کے بعد تاریخِ اِرتقائے نسلِ اِنسانی کا یہ سفر اُس سفر کی گردِ پا کو اپنے ماتھے کا جھومر بنا کر اِعتبار کی سند حاصل کیا کرے گا۔

۴۔ سب کچھ عطا کیا ہے خدا نے حضور ﷺ کو

کائنات کی کوئی شئے الذّی کے دائرے سے باہر نہیں، یہ ہر شئے پر محیط ہے۔ اسی طرح کائنات کی ہر شئے عَبْد ہے اور عَبْد بھی ہر شئے پر محیط ہے۔ آیتِ مقدسہ میں الذّی سے مراد خالق کائنات کی ذاتِ والا صفات ہے اور عَبْد سے مراد سردارِ کائنات حضور رحمتِ عالم ﷺ کی ذاتِ اَقدس ہے۔ ہم نے دیکھا کہ الذّی

کائنات کی ہر شئے پر محیط ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی ذات اپنی خالقیت، مالکیت، منتہائیت، معبودیت اور قدرت کے اعتبار سے کائنات کی ہر شئے پر حاوی اور محیط ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

اَلآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيۡءٍ مُّحِيۡطُ۔	خبردار! بے شک وہ (اپنے علم وقدرت سے) ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ (حم السجدہ، ۴۱:۵۴)

اسی طرح چونکہ کائنات کا ذرہ ذرہ **عبد** ہے اور **عبد** یعنی ذات رسول ﷺ بھی کائنات کی تمام اشیاء حتی کہ ایک ایک ذرے پر محیط ہے۔ گویا کائنات کا ایک ذرہ بھی **عبد** کامل یعنی تاجدار کائنات ﷺ کے دامن رحمت سے خارج نہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَ مَا اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَo	اور (اے رسول محتشم! ﷺ) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر ہی بھیجا ہےo (الانبیاء، ۲۱:۱۰۷)

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات خالق کائنات ہے، وہ کل جہانوں کا پالنے والا ہے، وہ لائق بندگی ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اپنی خلاقیت کے اعتبار سے ہر شئے پر محیط ہے۔ حضور ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں۔ تمام عالمین آپ کے دامن رحمت میں آ کر اپنے وجود کو معتبر بناتے ہیں۔ رحمت کے اعتبار سے حضور ﷺ ہر شئے پر محیط ہیں، اس لئے اگر کسی کو وجود کی حاجت ہو تو وہ اپنے وجود کی رحمت آپ کی ذات اقدس سے طلب کرتا ہے۔ ہر خیرات حضور ﷺ کے در سے ملتی ہے۔ فرمایا کہ اللہ دیتا ہے اور میں تقسیم کرتا ہوں۔ چنانچہ جسے اپنی بقا کی حاجت ہو، وہ بقا کی رحمت حضور ﷺ کے چشمہ حیات سے لیتا ہے۔ وہ شخص جسے کمال کی ضرورت ہو وہ کمال کی رحمت حضور ﷺ

کے کمال سے حاصل کرتا ہے۔ اللہ نے اپنے محبوب رسول کو سب کچھ عطا کیا ہے۔ وہ عطا ہی عطا ہیں، وہ سخا ہی سخا ہیں، کائنات کی ہر شئے دامن خیر البشر میں ہے۔

۵- حقیقت محمدی

بادیٔ النظر میں **الذی** اور **عبدہ** کا مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ کون **الذی** اور کون **عبدہ**؟ دونوں لفظوں میں ابہام پایا جاتا ہے اور جب تک نشاندہی نہ کی جائے ابہام دور نہیں ہوتا۔ مثلاً جب **الذی** کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ کس ہستی کی بات ہو رہی ہے اور جب **عبدہ** کا لفظ زبان سے نکالا جاتا ہے تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس بندے کی بات کی جا رہی ہے۔ **الذی** کے اس ابہام کا معنی یہ ہے کہ اس مقام پر **الذی** ایک ایسے مکمل حسن کا نام ہے جو اپنے حسن و جمال کے اعتبار سے ظاہر میں بھی ہے اور باطن میں بھی، لیکن عقل کے دائرہ اختیار سے باہر اور اس کی نظروں سے اوجھل ہے۔ کوئی آنکھ ربّ کائنات کے جلووں کا نظارہ نہیں کر سکتی۔ اسے جاننے کی قوت کوئی نہیں رکھتا۔ ارشادِ ربانی ہے:

لاَ تَدْرِكُهُ الاَبْصَارَ وَهُوَ يُدْرِكُ الاَبْصَارَ-	نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

(الانعام، ۶:۱۰۳)

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ لفظ **عبدہ** میں بھی ابہام پایا جاتا ہے کہ کون عبد؟ اس ابہام کا مطلب بھی یہ ہوگا کہ حضور ﷺ کے حسن کا جلوہ بھی عام ہے۔ ہر آنکھ دیکھنے والی نہیں مگر ہر کسی نے اپنی بصارت کے مطابق اکتساب نور کیا۔ ظاہر ہونے کے باوجود بھی اس حسن کی حقیقت سمجھ سے بالا اور آنکھ سے اوجھل ہے۔ کوئی مقام محمدی کو پا سکا ہے اور نہ حقیقت محمدی جان سکا ہے۔

چپ کر مہر علی ایتھے جا نئیں بولن دی

٦ - ہر حسنِ کائنات تری رہگذر میں ہے

یہ جو کائنات کی وسعتوں میں ہر لحہ رنگ ونور کی بارش ہو رہی ہے، کہکشاؤں کے جھرمٹ اپنے ہی ہالہ نور میں سمٹ رہے ہیں، ہر لحظہ عجائبات کا ظہور ہو رہا ہے اور قدم قدم پر امکانات کی نئی دنیاؤں کا انکشاف ہو رہا ہے، کارکنان قضا و قدر ہر آن مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں، کرہ ارضی نجانے کب سے اپنے محور پر محوخرام ہے۔ زمین پر سبزے کی نرم وگداز چادر نجانے کب سے اولاد آدم کے قدموں کی پذیرائی کا اعزاز حاصل کر رہی ہے۔ گھٹائیں پانی کی چھاگلیں بھر بھر کر بنجر زمینوں کی طرف رواں دواں ہیں، پھول رعنائیوں کے پیکر جمیل میں لپٹے ہوئے ہیں۔ الغرض حسن و جمال کا جو بھی مرقع ہے وہ یا تو خدائے عظیم وکریم کے حسن قدرت کی جلوہ گاہ ہے یا تاجدار ارض وسما جناب رسالتمآب ﷺ کے دامن رحمت کی خیرات ہے اس لئے کہ ''**الذی**'' اور ''**عبدہ**'' الگ الگ ہر شئے پر محیط ہیں۔ ہر شئے پر حاوی ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہر حسن، ہر جمال اور ہر کمال نور کے انہی دو سرچشموں سے سیراب ہوتا ہے۔ آب خنک کا ہر جرعہ انہی شاداب موسموں کی عطا ہے۔ یہ حسن کسی کو دکھائی دے یا نہ دے یہ اس کی بصارت کی کجی ہے ورنہ حسن تو ہر آن موجود ہے۔ کائنات کی ہر شئے انہی دو ذاتوں **الذی** (اللہ ربّ العزت) اور **عبدہ** (حضور سرور کونین ﷺ) کے حسن و جمال کی آئینہ دار ہے۔ کارخانہ قدرت کی ہر چیز اور آئینہ خانے کا ہر عکس اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حسن و جمال کا دریوزہ گر ہے۔ کائنات کا ہر حسن حضور ﷺ کی رہگزر میں آنکھیں بچھا رہا ہے۔

۷-اے کہ ترے وجود پر خالق دو جہاں کو ناز

آسمان سے اترنے والا ہر لفظ اور قلب اطہر پر نازل ہونے والا ہر پیغام، علم وحکمت اور دانائی کا حرف آخر ہے۔ آیت مقدسہ میں اگر ذات باری چاہتی تو اس مقام پر **عبدہ** کی جگہ **نبیه** یا **رسوله** کے الفاظ بھی استعمال کر سکتی تھی کہ پاک ہے وہ ذات جو اپنے نبی یا رسول کو سیر کے لئے لے گئی۔ ربّ کائنات نے سرکار دو عالم ﷺ کا ذکر جمیل بندہ کہہ کر کیا تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ حضور ﷺ کے مرتبہ نبوت اور مقام رسالت کو اگرچہ آپ ﷺ کی ذات اقدس سے جدا نہیں کیا جا سکتا مگر سدرۃ المنتہیٰ سے بھی آگے بلایا جانا بندگی کی شان کے ساتھ ہے کیونکہ دونوں کے فرائض جدا جدا ہیں۔ نبی یا رسول خالق سے مخلوق کی طرف آتا ہے۔ وہ خود ہی خدا کے قرب و وصال کی لذتوں سے آشنا ہونے کا خواہش مند نہیں ہوتا بلکہ اپنے ساتھ مخلوق کو بھی یہ لذتیں اور حلاوتیں عطا کرتا ہے جبکہ اس کے برعکس **عبد** مخلوق سے خالق کی طرف جاتا ہے۔ وہ خدا کی محبت اور اس کے مشاہدہ جمال میں غرق ہوتا ہے۔ اسی کے ذکر و فکر میں ڈوبا رہتا ہے۔ اس کی عبدیت اس وقت درجہ کمال کو پہنچتی ہے جب وہ اللہ کی ذات میں گم ہو جاتا ہے۔ گویا عبد مخلوق سے جتنا دور ہوتا ہے اتنا ہی خالق کے نزدیک ہوتا ہے۔ اسی لحاظ سے اس کا مرتبہ عبدیت بھی اتنا ہی بلند ہو گا تو چونکہ معراج میں حضور ﷺ خلق سے خالق کی طرف گئے لہٰذا اس مقام پر **عبد** کا لفظ ہی استعمال کیا گیا کہ اس میں قرب اور وصل کی حلاوتیں اپنی انتہا کو پہنچی ہوتی ہیں۔

۸-عالم بشریت کی زد میں

عربی زبان کے محاورے اور گرائمر کے قواعد و ضوابط کی رو سے لفظ **عبد** اگر

کسی زندہ شخص کے لئے مستعمل ہوتو اس سے جسم اور روح کا مجموعہ مراد ہوگا۔ اگر جسم زمین پر ہی رہے اور تنہا روح پرواز کر جائے تو اسے اسریٰ بروحہ کہا جائے گا، اسری بعبدہ نہیں ہوتا۔ گویا لفظ **عبد** کے استعمال سے بتانا یہ مقصود تھا کہ ربّ ذوالجلال نے اپنے پیارے رسول ﷺ کو عالم بیداری میں جسم اور روح کے ساتھ سفر معراج کی عظمتوں سے ہمکنار کیا اور اقلیم رسالت کے اس آخری تاجدار معظم ﷺ کو معجزہ معراج عطا کر کے اس خلعت فاخرہ سے نوازا جس کے حضور ﷺ پہلے اور آخری حقدار ٹھہرے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک یہ معجزہ کسی دوسرے نبی کو عطا نہیں ہوا۔ یہ اعزاز صرف اور صرف نبی آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کے حصے میں آیا کہ انہیں ان کے ربّ نے روح وجسم کے ساتھ آسمانوں کی سیر کرائی اور انہیں فضیلت کی ساری دستاروں کے لئے مختص کر دیا۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

۹- شاہکارِ صنّاعِ اَزل

حضور نبی رحمت ﷺ کی ذات اقدس صناع ازل کا شاہکار بے مثال کہ نہ کوئی نظیر نہ کوئی مثیل۔ جس طرح خدائے لم یزل اپنی ربوبیت میں یکتا وتنہا اسی طرح یتیم عبداللہ حضور نبی اکرم ﷺ بھی اقلیم رسالت میں یکتا وتنہا۔ پوری کائنات رسول ازل ﷺ کے قدموں کا تصدق، تمام روشنیاں انہی کی زلف معنبر کا عکس جمیل، نہ کوئی نقص نہ کوئی عیب، نہ کوئی کجی نہ کوئی کمی، کسی بھی زاویہ نگاہ سے دیکھیں کسی بھی پیمانے یا کسوٹی پر پرکھیں حضور ﷺ خدائے لاشریک کی تخلیق بے مثال، شاہکار لازوال، رسول اول وآخر، نبی امروز وفردا ﷺ۔ تخلیق کار بہت سی چیزیں تخلیق کرتا ہے لیکن اس کی ہر

تخلیق شاہکار نہیں ہوتی۔ حضورﷺ قدرت کا وہ شاہکار بے مثال ہیں جس پر ربّ کائنات بھی مفتخر ہے اور اس پر خالق کائنات اور ملائکہ بھی درود بھیجتے ہیں۔ بلاتمثیل و بلا مثال اس مقام پر اللہ ربّ العزت نے یہ فرمانے کی بجائے کہ جس نے ''بندے'' کو سیر کرائی بلکہ یوں فرمایا کہ جس نے ''اپنے بندے کو سیر کرائی'' گویا فرمایا جا رہا ہے کہ خبردار! یہ میرا کوئی عام بندہ نہیں۔ اپنے میں جو اپنائیت ہے، جو چاہت ہے، وہ محبوبیت کے ہزار رخ آشکار کر رہی ہے۔ ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ بندہ تو ہر کوئی ہے لیکن ہر بندہ ایسا بندہ نہیں ہوتا کہ اس پر فخر کیا جا سکے اور ڈنکے کی چوٹ پر کیا جائے۔ میرے اس بندے کو ہر پہلو سے دیکھو، ہر حوالے سے جانچو، تمہیں کوئی نقص نظر نہیں آئے گا، کوئی کجی دکھائی نہیں دے گی کہ یہ میرے حسن تخلیق کا شاہکار ہے۔ کسی تخلیق کو اپنانا اسے اپنے تعارف میں پیش کرنا یقیناً غیر معمولی بات ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ

عبد دیگر عبدہ چیز دگر
ایں سراپا انتظار اُو منتظر

اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلاً کے ایمان افروز نکات

نالہ ہائے نیم شبی ندامت کے آنسوؤں کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور احساس ندامت کیساتھ چشم تر کا سجدہ اللہ کے ہاں بے حد مقبول ہے کہ وہ اپنے بندوں کے گناہ معاف کرنے اور انکی توبہ قبول کرنیوالا ہے۔ لفظ ''اسری'' اسراء سے ہے۔ عربی لغت کے مطابق اسراء کا معنی ''رات کے وقت سیر کرنا ہے'' رات کیلئے اس لفظ کا استعمال غالب ہے۔ اللہ ربّ العزت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا۔

فَاَسۡرِ بِعِبَادِیۡ لَیۡلاً۔ (ہم نے فرمایا) تو لے جاؤ میرے بندوں کو راتوں رات۔
(الدخان، ۴۴:۲۳)

آیت مذکورہ کی روشنی میں لفظ اسریٰ کا معنی یہ ہوا کہ اس (اللہ تبارک و تعالیٰ) نے رات کے وقت سیر کرائی۔ ذہن انسانی میں سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ یہ سفر رات کے وقت ہی کیوں کرایا گیا۔ اس میں کونسی حکمت کارفرما تھی۔ ان حکمتوں میں سے چند کا بیان ذیل میں کیا جاتا ہے:

۱۔ حصول مقصد میں رات کی فضیلت

رات کو دن پر کئی حوالوں سے فضیلت دی گئی ہے۔ ان گنت اعزازات، بے شمار امتیازات اس کے دامن خوشرنگ میں روشن ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ قرآن پاک رات کے وقت نازل کیا گیا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے۔

إِنَّا أَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ٥ — بے شک ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں اتارا ہے ٥ (القدر، ۹۷:۱)

علیم وخبیر ربّ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملاقات سے قبل ایک مجاہدے سے گزارنے کا فیصلہ کیا تو انہیں پروردگار عالم کی طرف سے تیس دن کے اعتکاف کا حکم ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تیس دن کے لئے دنیا کی مصروفیتوں سے ناطہ توڑ کر اپنے مالک حقیقی کی یاد کا چراغ روشن کرو۔ توبہ استغفار میں ایک ایک لمحہ گزارو، بعد میں تیس دن کی بجائے چالیس دن کر دیئے گئے۔ ان چالیس دنوں میں رات کو بھی مجاہدے اور ریاضت کا عمل جاری رہتا اور دن کو بھی۔ دن کو بھی انہیں کہیں جانے کی اجازت نہ تھی۔ حصول مقصد کے لئے رات چونکہ دن سے افضل ہے لہٰذا اس مجاہدے کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں کیا گیا:

وَاِذْ وَعَدْنَا مُوْسٰى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً — اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے

موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ فرمایا۔ (البقرہ،۲:۵۱)

آخر شب کی دعاؤں کی رقت انگیزی کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ بندہ راتوں کو پروردگار سے اپنے گناہوں کی معافی کا طلبگار رہوتا ہے تو رحمت خداوندی اسے اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے، اس لئے عرفائے کرام اور اولیائے عظام فرماتے ہیں کہ اللہ کے بندوں کے لئے رات تخت سلطنت کی طرح ہوتی ہے کہ اس تخت پر بیٹھ کر وہ ندامت کے آنسو بہاتے ہیں اور گڑگڑا کر اپنے خالق سے اپنی مغفرت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ جو احوال دن میں طے نہیں ہوتے وہ رات کی تنہائیوں میں طے ہوتے ہیں۔ مشعل آرزو رات کے طاقچوں ہی میں فروزاں ہوتی ہے۔ قرب الٰہی کے لمحات اور وہ ساعتیں (جن میں خدائے رحیم وکریم کی خاص عنایتوں سے نوازا جاتا ہے اور خصوصی سعادتیں نصیب ہوتی ہیں) بھی رات ہی کے دامن میں رکھی گئی ہیں:

وَ مِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّکَ۔

اور رات کے کچھ حصہ میں (بھی) قرآن کے ساتھ (شب خیزی کرتے ہوئے) نماز تہجد پڑھا کریں۔ (الاسراء،۱۷:۷۹)

معراج کا سفر بھی رات ہی کو اختیار کیا گیا۔ حضور ﷺ کو جتنی فضیلتیں عطا کی گئیں معراج کی فضیلت ان سب سے بڑھ کر تھی اور یہ فضیلت بھی رات ہی کے وقت دامن مصطفیٰ ﷺ میں سجائی گئی۔

۲۔ شب جائے کہ من بودم

تقویٰ، پرہیزگاری اور تزکیہ نفس کے چراغ رات کے دامن ہی میں روشن ہوتے ہیں۔ آقائے دوجہاں ﷺ ساری ساری رات عبادت میں گزار دیتے، یہاں

تک کہ پاؤں مبارک میں ورم آ جاتا۔ دن کو جلوت میسر آتی ہے اور رات کو خلوت، خاص طور پر آخر شب کا وقت انتہائی خلوت کا ہوتا ہے۔ خالق ارض وسماوات اپنی شان کے مطابق آخر شب ہی آسمان دنیا پر نزول فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا سچی محبت کرنے والے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ محبوب تو جاگ رہا ہے اور وہ سو رہے ہیں۔

لَاتَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ– نہ اس کو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔

(البقرہ، ۲:۲۵۵)

محبوب کی تو یہ شان ہے اور ادھر محبت کا دعویدار غفلت کی نیند سو رہا ہے۔ اللہ ربّ العزت اپنے بندے کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرا رہے ہیں کہ وہ خود احتسابی کے عمل سے بھی گزریں۔ اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھیں کہ وہ محبت الٰہی کے دعوے میں کس حد تک سچے ہیں۔ کیا وہ اپنے محبوب سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل کرنے کے لئے اپنے نرم وگداز بستروں سے اٹھ جاتے ہیں یا ان کی محبت کے دعوے پر نیند غالب رہتی ہے۔ ویسے بھی رات میں دو لمحوں کی ملاقات بھی کئی سالوں کی محنت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍo شب قدر (فضیلت و برکت اور اجر و ثواب میں) ہزار مہینوں سے بہتر ہےo

(القدر، ۹۷:۳)

معراج کا سفر عظمت سفر محبت بھی تھا، محبّ اور محبوب کی ملاقات کا سفر تھا۔ اس سفر کا مقصد جلیلہ اس صاحب شعور کے ذہن میں آ سکتا ہے جو خود بھی رات کو اٹھ اٹھ کر اپنے پروردگار سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہو۔ آخر شب سجدہ ریزی جس کا معمول ہو، جو صدیق اکبرؓ جیسی چشم بصیرت رکھتا ہو اور جو شب کی خلوتوں میں اترنے والے

انعامات واکرامات کا عینی شاہد ہو۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر شب معراج رونما ہونیوالے عجائبات کی تصدیق کر دی اور وہ لوگ جو رات کی خلوتوں کی اہمیت کے شناسا نہ تھے اور تمام تر واقعات کا ابوجہل کی چشم کور سے مشاہدہ کرر ہے تھے، واقعہ معراج کا انکار کر بیٹھے اور دولت ایمان سے محروم رہے۔

۳۔وقت کی طنابیں سمیٹ لی گئیں

سفر معراج رات کے وقت کرایا گیا۔ یہ سفر عظمت پوری رات کا سفر نہ تھا بلکہ رات کے انتہائی قلیل عرصے پر محیط تھا۔ چونکہ اسری کے اندر رات کا معنی بھی پایا جاتا ہے لہٰذا اس آیت میں لیلاً کا باقاعدہ اضافہ کوئی خاص معنی رکھتا ہے جس سے کسی خاص نکتے کی طرف توجہ مبذول کرنا مقصود ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ سفر اپنی قدرت کاملہ کے ذریعے کرایا لہٰذا اسکی جملہ جزئیات کا انکار اللہ کی قدرت کاملہ کا انکار ہے۔ یہ سفر اس تیزی سے طے ہوا کہ کسی کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ عقل اس معجزہ پر بھی عاجز اور بے بس ہے۔ اگر کوئی عقل کی کسوٹی پر ان واقعات کو پرکھے گا تو سوائے گمراہی کے اسے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ سفر کی اسی تیزی کو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

ما فقد جسد رسول الله ليلة المعراج۔

معراج کی رات حضور ﷺ کا جسد اقدس (گویا) کہیں گیا ہی نہیں تھا۔

(طبری، ۱۵: ۱۳)

(الشفاء، ۱: ۲۴۶)

۴-سفر لامکاں

آیت مقدسہ میں لیلاً (رات) کا لفظ استعمال کرنے کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ رات کا وقت سورج اور اس کی روشنی سے پاک ہوتا ہے جبکہ دن کا وقت سورج کی روشنی ہر شئے پر محیط ہوتی ہے۔ گویا مخلوق کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ سفر نظام شمسی کے دائرے میں نہیں تھا بلکہ نظام شمسی کے دائرے سے باہر کا سفر ہے۔ حتیٰ کہ یہ سفر اس زمین اور آسمان کا بھی نہیں بلکہ یہ سفر تو لامکاں کی وسعتوں کا سفر ہے، حدود وقت سے آگے نکل جانے کا سفر ہے۔ خدا کے عظیم پیغمبر ﷺ کا یہ عظیم سفر عرش معلٰی اور سدرۃ المنتہیٰ کا سفر ہے۔

فصل دوم

سورۃ والنجم کی روشنی میں واقعہ معراج

منبعِ علم و دانش قرآن مجید فرقان حمید میں واقعہ معراج تین الگ الگ مقامات پر بیان ہوا ہے۔ سورۃ النجم میں سفرمعراج کا ذکرجمیل قدرے تفصیل سے ہوا ہے۔فرمایا:

وَ النَّجْمِ اِذَا هَوٰی o مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰیo وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهُوٰی o اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰیo عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰیo ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰیo دَنَا فَتَدَلّٰیo فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی o فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰیo

(النجم،۵۳:۱-۱۰)

قسم ہے روشن ستارے (وجودمحمدی ﷺ) کی جب وہ (شب معراج عرش بریں پر عروج فرما کر زمین کی طرف) اتراo تمہارے آقا نہ (کبھی) گمراہ ہوئے اور نہ بے راہ چلےo اور وہ اپنی خواہش سے کلام نہیں فرماتےo ان کا فرمانا فقط وحی الٰہی ہی ہوتی ہے جو (انکی طرف) کی جاتی ہے o انہیں سکھایا سخت قوتوں والے بہت زبردست (اللہ) نےo پھر اس (اللہ) نے استویٰ فرمایاo اس حال میں کہ وہ (محمد ﷺ) سب سے اونچے کنارے (دائرہ امکان کے منتہیٰ) پر تھےo پھر قریب ہوا (اللہ محمد ﷺ سے) پھر زیادہ قریب ہواo تو (محمد ﷺ اپنے ربّ سے) دو کمانوں کی مقدار

(نزدیک) ہوئے بلکہ اس سے (بھی)
زیادہ قریبo تو وحی فرمائی اپنے عبد
مقدس کو جو وحی فرمائیo

اللہ ربّ العزت نے ان آیات مقدسہ کے آغاز میں قسم اٹھائی ہے اور یقیناً ربّ العالمین کا قسم اٹھانا ایک غیر معمولی بات ہے۔ ایک غیر معمولی واقعہ کی تمہید کو اجاگر کرنا مقصود ہے۔ خالق کائنات کا کسی واقعہ کو بیان کرنے سے پہلے قسم اٹھانا اس بات کی بھی دلیل ہے کہ جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے وہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور جس ہستی معظم کے بارے میں یہ واقعہ بیان ہو رہا ہے، وہ ہستی کن عظمتوں اور رفعتوں کی حامل ہے! اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خدائے رحیم و کریم کسی وقیع معاملے کا انکشاف فرما رہے ہیں۔ اس غیر معمولی اہتمام کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بندوں پر یہ آشکار کرنا بھی مقصود ہے کہ اس معجزۂ معراج کو اپنی ناقص عقل کی کسوٹی پر نہ پرکھیں بلکہ اس خالق ارض وسماوات کی قدرت کاملہ کا مظہر جان کر دل و جان سے قبول کر لیں۔ فرمایا: قسم ہے ستارے کی جب وہ اترے۔ مذکورہ آیات کی پہلی آیت میں ''**نجم**'' اور ''**ھوی**'' کے الفاظ معنی خیز بھی ہیں اور ہمیں غور و تدبر کی دعوت بھی دے رہے ہیں۔

لفظ نَجْم کا مفہوم

عربی لغت میں نجم کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے:

لفظِ نَجْم کا پہلا معنی

یہ لفظ عربی زبان و ادب میں کبھی اسم کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس کا استعمال بطور مصدر عمل میں لایا جاتا ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ

اگر لفظ **نجم** بطور اسم استعمال ہو تو اس کا ایک معنی یہ لیا جائے گا کہ کسی چیز کی اصل، مبداء، Root اور Range مثلاً کسی درخت کی جڑ، جو ایک تناور درخت کی اصل ہوتی ہے۔ جس جگہ سے کوئی چشمہ پھوٹے اس جگہ کو بھی **نجم** کہا جاتا ہے۔ چشمہ سب کو سیراب کرتا ہے۔ سنگلاخ چٹانوں کو بھی شاداب موسموں کی نوید دیتا ہے۔

فن حدیث میں لفظ **نجم** استعمال ہوتا ہے۔ یہ اس حدیث کے لئے آتا ہے جو اپنا اصل نہ رکھتی ہو، یعنی بے بنیاد اور من گھڑت ہو مثلاً جب یہ کہا جائے کہ **هذا الحديث لا نجم له** تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس حدیث کی کوئی اصل نہیں۔ یہ بے بنیاد اور من گھڑت ہے۔

لفظ نجم کا دوسرا معنی

آیتِ مذکورہ میں **نجم** سے مراد حضور ختمی مرتبت ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ ''قسم ہے ستارے کی جب وہ اترے'' معراج کی شب عظمت کا تاج کس رسول محتشم ﷺ کے سر اقدس پر سجایا گیا، کھلے آسمانوں کی سیر کرائی گئی۔ ظاہر ہے یہ حضور ﷺ کی ذات تھی اور خدا اپنے محبوب ﷺ کو ستارے سے تشبیہہ دے رہا ہے۔ ستارا جو روشنی کی علامت ہے، ستارہ جو حرکت اور زندگی کا استعارہ ہے۔ حضرت امام جعفر صادق فرماتے ہیں:

النجم انه محمد۔ **نجم** سے مراد محمد ﷺ ہیں۔

(روح المعانی، ۱۴:۴۵)

(تفسیر المظہری، ۹:۱۰۳)

لفظ نجم کا تیسرا معنی

ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ **نجم** سے مراد حضور ﷺ کا قلب اطہر

ہے، وہ قلب مقدس جس پر اس عظیم سفر کی جزئیات رقم ہوئیں۔ اگر یہ معنی لیا جائے تو بھی مراد حضور ﷺ کی ذات اقدس ہی ٹھہرتی ہے۔

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰی کا پہلا معنی......اصلِ کائنات

اکثر محدثین ومفسرین نے **نجم** سے مراد حضور ﷺ کی ذات اقدس کو ہی لیا ہے۔ امام رازیؒ نے ''تفسیر کبیر'' میں، علامہ آلوسیؒ نے ''روح المعانی'' میں، امام خازنؒ نے ''تفسیر خازن'' اور نبہان بقلیؒ نے ''عرائس البیان'' میں **نجم** کے اسی مفہوم کو اعتماد واعتبار کی سند عطا کی ہے۔ ان کے علاوہ دیگر متعدد ائمہ تفسیر نے بھی **نجم** سے مراد سیاح لامکاں حضور سرور کائنات ﷺ کی ذات اقدس ہی لی ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ **نجم** کی شرح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''خدا کی ذات بابرکات نے کنائے اور اشارے کے پیرائے میں حضور نبی اکرم ﷺ کی رخشندہ وتابندہ ذات کی قسم کھائی اور فرمایا: قسم ہے اے محبوب! کہ تو اصل ہے''۔
(المفردات: ۴۸۳)

بعض ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر حضور ﷺ اصل اور جڑ ہیں تو یہ کس چیز کی اصل یا جڑ ہیں! جب ہم قرآن سے اس سوال کا جواب پوچھتے ہیں تو قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ کسی شئے کا نام نہیں لیتا بلکہ مطلقاً کہتا ہے ''**والنجم**''۔ قاعدہ اور ضابطہ یہ ہے کہ اگر کہہ دیا جائے کہ بندہ فلاں چیز کی اصل اور منبع ہے تو یہ اصل اور منبع ہونا اس چیز کے ساتھ مختص ہوکر رہ جائے گا۔ اس اصل اور منبع کو دوسری چیزوں کا اصل اور منبع ہونے کا درجہ حاصل نہ ہو سکے گا اور اگر کسی چیز کا نام نہ لیا جائے واس سے مراد ہر ہر چیز کی اصل ومنبع ہوتا ہے۔ ربّ کائنات نے اپنے محبوب ﷺ کا نام لے کر انہیں محدود کرنا پسند نہیں فرمایا۔ اس لئے ذات سرکار ﷺ کو کسی شئے سے مختص نہیں کیا

گیا۔ جن و انس، شمس و قمر، شجر و حجر، برگ و ثمر، نباتات و جمادات، حور و غلمان، غرض کائنات ہست و بود کا وجود و ظہور سب کچھ تاجدارِ کائنات حضور رحمت عالم ﷺ کی ذات مقدسہ کے توسل اور تصدق ہی سے قائم ہے۔ محبوب اگر تجھے پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو یہ سورج ہوتا اور نہ یہ چاند ستارے۔ اس آیت مقدسہ میں **نجم** سے حضور ﷺ کی ذات مراد لے کر حضور ﷺ کو مقصود کائنات ٹھہرایا جا رہا ہے۔ اس کائنات رنگ و بو میں صرف دو وجود ہیں:

۱۔ اللہ ...... کہ وہ خالق کائنات ہے۔

۲۔ ماسوا اللہ ...... اللہ کے سوا باقی سب کچھ یعنی تمام مخلوقات اور اشیاء اور اجسام فلکی وغیرہ

اللہ کی اصل اور جڑ کا تصور بھی شرک ہے۔ چونکہ اللہ کی اصل کا ہونا تو ممکن نہیں اس لئے اصل و جڑ مخلوقات ہی ہوسکتی ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور پھر تمام مخلوقات میں سب سے افضل و برتر حضور ختمی مرتبت ﷺ کی ذات اقدس ہے۔ گویا اللہ کے سوا اس کائنات رنگ و بو کی ہر چیز کی اصل یا جڑ آقائے نامدار حضور سرور کون و مکاں ﷺ ہیں۔ قسم ہے اے محبوب! تیری کہ میرے سوا اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے یا بعد میں ہوگا، محبوب تو ان سب کی اصل ہے۔ یہ سب کچھ تیرے قدموں کی خیرات ہی تو ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ اصل کے مقابلے میں ہر شئے فرع ہوتی ہے۔ اللہ ربّ العزت نے فرمایا: قسم ہے محبوب تیری کہ تو اصل ہے، اس کائنات رنگ و بو کا مرکز و منبع ہے۔ معلوم ہوا کہ اصل فقط محبوب ربّ کریم ہیں اور باقی ساری کائنات آپ کی فرع ہے۔ خالق کائنات نے اپنے محبوب ﷺ کی کسی فرع کو انسانی شکل عطا کر

دی، کسی کو جنات کا روپ دے دیا، کسی کو ملائکہ بنا دیا، کسی کو شجر و حجر کا درجہ دے دیا، کسی کو شمس و قمر بنا دیا، کسی کو آسمان اور کسی کو زمین کا وجود بخش دیا اور حضور ﷺ کی کسی فرع کو تحت الثریٰ و کسی کو عرش معلٰی بنا دیا۔

سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایتِ اولیٰ تمہی تو ہو

تصویرِ کائنات کا مرکزی خیال

حضور ﷺ اس کائنات رنگ و بو کا مرکزی نقطہ ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے وجود کائنات کا مبداء ہیں۔ تاجدار کائنات ﷺ ذات بابرکات **لو لاک لما** کے مصداق تمام کائنات کی اصل ہیں، اسی لئے آقا حضور ﷺ کو روح کائنات بھی کہتے ہیں۔ آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ گویا آپ ﷺ کے کرم کا سائبان کائنات کی ہر شئے پر محیط ہے۔ یہ چشمۂ فیض ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ کائنات ارض و سماوات میں موجود ہر شئے اپنے وجود کے لئے حضور ﷺ کے قدموں کے دھوون کی محتاج ہے، سلطان بحر و بر کے نقش کف پا کے تصدق کی مرہون منت ہے، اس لئے کہ حضور ﷺ کی خلقت تو اس وقت ہو چکی تھی جب عالم رنگ و بو ابھی تخلیق نہیں کیا گیا تھا۔ آپ ﷺ ہی کے قدموں کے صدقے اس عالم ہست و بود کو خلعت وجود سے نوازا گیا۔

تصویرِ کائنات کا وہ مرکزی خیال
لوحِ جہاں پہ عظمتِ یزداں کہیں جسے

تاجدارِ کائنات ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

اول ما خلق الله نوری ومن نوری خلق کل شئ– (تفسیر روح البیان،۲:۳۷۰)	سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے میرے نور کو پیدا فرمایا۔ پھر میرے نور سے ہر چیز کو بنایا۔

مذکورہ حدیث مقدسہ کا مطلب یہ ہے کہ حضور رحمت عالم ﷺ فرما رہے ہیں کہ میری ذات براہ راست اللہ ربّ العزت کے نور سے اکتساب فیض کر رہی ہے جبکہ یہ ساری کائنات، اس کائنات کا ذرہ ذرہ، یہ تمام اجسام فلکی، چرند پرند، ملائکہ، جنات، شجروحجر، شمس وقمر، غرض کائنات کی ہر شئے میرے نور سے فیض یاب ہو رہی ہے۔

حضرت جابرؓ نے آقا حضور ﷺ سے دریافت فرمایا:

یارسول الله! بابی انت و امی، اخبرنی عن اول شئ خلقه الله تعالی قبل الاشیاء، قال: یا جابر ان الله تعالی قد خلق قبل الاشیاء نور نبیک من نوره، فجعل ذلک النور یدور بالقدرة حیث شاء الله، ولم یکن فی ذلک الوقت لوح و لاقلم و لا جنة و لا نار و لا ملک و لا سماء و لا ارض و لا شمس و لا قمر و لا جن و لا انس، فلما اراد الله تعالی ان	یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں مجھے بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کیا چیز پیدا فرمائی؟ حضور ﷺ نے فرمایا: اے جابر! بے شک اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات سے پہلے تیرے نبی کا نور اپنے نور سے پیدا فرمایا۔ پھر وہ نور مشیت ایزدی کے مطابق جہاں چاہتا سیر کرتا رہا۔ اس وقت لوح تھی نہ قلم، جنت تھی نہ دوزخ، فرشتہ تھا نہ آسمان، نہ زمین تھی، سورج تھا نہ چاند، جن تھا نہ انسان۔ جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا

يخلق الخلق قسم ذلك النور اربعة اجزاء، فخلق من الجزء الاول القلم و من الثانى اللوح و من الثالث العرش، ثم قسم الجزء الرابع اربعة، فخلق من الاول حملة العرش ومن الثانى الكرسى والثالث باقى الملائكة، ثم قسم الرابع الاربعة اجزاء، فخلق من الاول السموت و من الثانى الارضين و من الثالث الجنة والنار......

(المواہب اللدنیہ، ۱:۹)
(السیرۃ الحلبیہ، ۱:۵۰)
(زرقانی علی المواہب، ۱:۴۶)

کہ مخلوقات کو پیدا کرے تو اس نور کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلے حصے سے قلم بنایا دوسرے سے لوح، تیسرے سے عرش اور چوتھے کو پھر چار حصوں میں تقسم کیا، پہلے حصہ سے عرش اٹھانے والے فرشتے بنائے، دوسرے سے کرسی اور تیسرے سے باقی فرشتے بنائے، پھر چوتھے حصے کو مزید چار حصوں میں تقسیم کر دیا، پہلے سے آسمان بنائے، دوسرے سے زمین اور تیسرے سے جنت ودوزخ......

کثیر ائمہ کرام جن میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ جیسی نابغۂ روزگار ہستیاں شامل ہیں، نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ اسی بنا پر سرکار دوعالم ﷺ کو مبداء کائنات کہا جاتا ہے۔ آپ ہی وجہ تکوین عالم ہیں۔ کائنات کا سارا حسن، حسن محمدی ﷺ ہی کی ایک جھلک ہے۔ پھولوں میں خوشبو انہی کے نقش قدم کا فیضان ہے، ستاروں میں روشنی انہی کے وجود مسعود کا پرتو ہے۔ اگر حضور ﷺ کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو سورج کو خلعت نور عطا ہی نہ ہوتی بلکہ سرے سے اس کا وجود ہی نہ ہوتا۔

ھو ی کا لفظ **النجم** کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو چونکہ **ھو ی** میں ظہور کا معنی پایا جاتا ہے اس لئے آیت کا ترجمہ کچھ یوں ہوگا:

اے محبوب! قسم ہے تیری کہ تو اصل کائنات ہے اور قسم ہے تیری کہ تیرا نور مخفی تھا۔ جب میں نے چاہا تو منصۂ شہود پر ظاہر ہو گیا۔

(روح المعانی، ۱۴:۴۵)

اگر غور کیا جائے اور منشائے ایزدی کو حیطۂ شعور میں لایا جائے تو انکشاف ہو گا کہ ربّ کائنات تخلیق محمدی کی قسم کھا رہا ہے۔ بالفاظ دیگر پروردگار عالم صبح ولادت باسعادت کی قسم کھا رہا ہے۔ یہ کائنات رنگ و بو اس نے اپنے محبوب ﷺ کے تذکرہ جلیلہ کی خاطر ہی تو سجائی ہے کہ جس میں ہر لمحہ اس کے محبوب ﷺ کی آمد کا ذکر ہو رہا ہے۔ تمام الہامی صحیفے صبح میلاد کے طلوع کی بشارت سے سرفراز نظر آتے ہیں۔

ظہور مصطفی ﷺ

مقصود کائنات حضرت محمد ﷺ کا وجود پاک اپنے ظہور کے اعتبار سے تین مراحل سے گزرا۔

۱- مرحلۂ تخلیق

۲- مرحلۂ ولادت

۳- مرحلۂ بعثت

۱- مرحلۂ تخلیق

تخلیق محمدی ﷺ سے مراد حضور ﷺ کے وجود مسعود کا وہ ظہور اول ہے جب اللہ ربّ العزت نے وجود نبوی کو عالم عدم سے عالم وجود میں منتقل کیا۔

۲-مرحلۂ ولادت

۱۲ ربیع الاول اس لحاظ سے کائنات کا سب سے عظیم دن ہے کہ اس دن حضور ﷺ اس عالم رنگ و بو میں تشریف لائے، ولادت باسعادت وجودِ مسعود کے ظہور کا دوسرا مرحلہ ہے۔

۳-مرحلۂ بعثت

حضور سرورِ کائنات ﷺ کے وجودِ مسعود کے ظہور کا تیسرا مرحلہ بعثت مبارکہ کا ہے۔ یہ مرحلہ حضور ﷺ کی حیات مقدسہ کے چالیسویں سال میں ظہور پذیر ہوا۔

ظہورِ مصطفیٰ ﷺ کے ان تینوں مراحل کو ظہورِ اول، ظہورِ ثانی اور ظہورِ ثالث کے عنوان کے تحت بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ اللہ ربّ العزت نے ستارہ محمد ﷺ کی قسم کھائی۔ گویا ان تینوں مراحل کی قسم اٹھا کر اپنے محبوب کی عظمتوں اور رفعتوں میں اضافہ فرمایا۔ پیارے محبوب! قسم ہے تیری کہ تو چمکتا ہوا ستارۂ اول الخلق ہے، قسم ہے تیری کہ تو نے آمنہ کے گھر قدم رنجہ فرمایا اور اے محبوب! قسم ہے تیری کہ ہم نے چالیس سال کی عمر میں تجھے انسانوں کی رہبری کے لئے مبعوث فرمایا۔

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر

نبی مکرم ﷺ رسول اول بھی ہیں اور رسول آخر بھی، رسول ازل بھی اور رسول ابد بھی، اس لئے کہ جو چیز مطلقاً اصل ہو وہ حقیقتاً سب سے اول ہوتی ہے اور جو چیز حقیقتاً سب سے اول ہوتی ہے وہی چیز واقعتاً سب سے آخر میں ہوتی ہے۔ اس نکتے کی وضاحت میں دو مثالیں درج کی جاتی ہیں:

پہلی مثال: کاغذ پر دائرہ بنانے کے لئے جس نقطے سے آغاز کیا جائے وہ نقطہ حرف اول ہوگا اور دائرہ مکمل ہونے پر جہاں مکمل ہوگا وہ نقطہ حرف آخر ہوگا۔ گویا یہ نقطہ آخر وہی نقطہ ہے جہاں سے دائرہ کا آغاز ہوا تھا۔ ثابت ہوا کہ جو حقیقت میں اول ہوتا ہے وہی واقعتاً آخر ہوتا ہے۔ اسی لئے حضور ﷺ کو رسول اول اور رسول آخر کہا جاتا ہے۔ اللہ ربّ العزت نے **والنجم اذا ھوی** میں حضور ﷺ کو کائنات کا نقطہ آغاز قرار دیتے ہوئے آپ کی اس اولیت کی قسم کھائی ہے۔ قادر مطلق کا قسم کھانا اس بات کی علامت ہے کہ اے محبوب! تو اس کائناتِ رنگ و بو کا حقیقتاً اول ہے اور واقعتاً آخر بھی تو ہے۔ اقبالؒ نے کہا تھا:

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین، وہی طٰہٰ

دوسری مثال: فرض کیجئے کہ آم کا ایک درخت لگایا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے سب سے پہلے آم کی گٹھلی زمین میں بوئی جاتی ہے۔ پھر وہ گٹھلی زیرِ زمین تخلیق کے عمل سے گزرتی ہے۔ اس کی کونپلیں زمین کا سینہ چاک کر کے سطح زمین پر نمودار ہوتی ہیں۔ پھر یہ ننھی منی کونپلیں نشو ونما پا کر تنا بنتی ہیں۔ پھر اس تنے سے شاخیں نکلتی ہیں اور ان شاخوں پر پتے اور پھول آتے ہیں۔ پھول پھل بنتے ہیں۔ شاخیں پھلوں سے جھک جاتی ہیں۔ یہ شاخوں کا اظہار عجز ہوتا ہے۔ یہ بارگاہ خداوندی میں ان کا سجدۂ شکر ہوتا ہے کہ پروردگار تو نے ہمیں ثمر بار کیا اور پھر جب موسم آتا ہے تو یہی پھل آم کی صورت میں پک جاتا ہے۔ لوگ اسے کھاتے ہیں۔ آخر میں جو چیز رہ جاتی ہے یہ وہی گٹھلی ہوتی ہے جسے زمین میں بویا گیا تھا۔ وہی شئے جو درخت کی زندگی میں حرف اول تھی اس کی زندگی میں حرف آخر بھی ٹھہری۔ درخت کی زندگی کا سفر جہاں سے شروع ہوا تھا

ختم بھی وہیں پر ہوا۔ یہ تخلیق کی وہ کائناتی سچائی ہے جس کا پوری کائنات میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ گویا آیت مقدسہ میں **والنجم** کہہ کر اللہ ربّ العزت نے حضور ﷺ کی اولیت کی ہی نہیں حضور ﷺ کی آخریت کی بھی قسم کھائی۔ اسی لئے نبی آخر الزماں ﷺ کے سرِ اقدس پر ختم نبوت کا تاج سجایا گیا کہ محبوب! اب تیرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ تیرے ساتھ ہی ہماری وحی کا دروازہ بھی بند ہو جائے گا۔ اب قیامت تک ہر صدی تیری صدی ہے، ہر زمانہ تیرا زمانہ ہے۔ وہ قرآن جو تجھ پر نازل کیا گیا وہ بھی آسمانی ہدایت کا حرف آخر ہے کیونکہ اے محبوب! تو رسول آخر ہے، تمام فضیلتیں تجھ پر ختم ہو رہی ہیں۔ تمام عظمتیں تیرے قدموں پر نثار ہو رہی ہیں۔ اب تیرے قدموں تک پہنچنا ہی انسانیت کی معراج ہے۔ اے محبوب قسم ہے تیری کہ تو کائنات کا وجود اول بھی ہے اور کائنات کا وجود آخر بھی تو ہی ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ اول و آخر ہونا اللہ تبارک وتعالیٰ کی بھی شان ہے۔ اس نے اپنے محبوب ﷺ کو بھی اسی شان کا مظہر بنایا۔ وہ خالق ہو کر اول و آخر، یہ مخلوق ہو کر اول و آخر، وہ اپنی ربوبیت میں یکتا و تنہا، یہ عبدیت میں اپنا مثال آپ۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ مخلوق کا موازنہ کسی صورت میں بھی خالق کائنات سے نہیں کیا جا سکتا۔ وہ خالق ہے یہ مخلوق، وہ معبود ہے یہ عابد، وہ مولائے کائنات ہے یہ رسول کائنات، وہ ربّ العالمین ہے یہ رحمۃ للعالمین۔

حدیث قدسی میں ارشاد ربانی ہے:

جعلتک اول النبیین خلقا واخرھم بعثا۔	میں آپ کو پیدا ہونے میں تمام انبیاء سے اول لایا اور ظاہر ہونے میں سب سے آخر میں۔
(شفاء، ۱: ۲۴۰)	

حضور سرورِ کون و مکاں ﷺ کی پیدائش کائنات کا نقطۂ آغاز یا وجودِ اول ہے اور آپ سلسلۂ انبیاء کے ظہور میں آخری نبی ہیں۔ قرآن مجید فرقان حمید میں ربّ کائنات نے فرمایا:

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰیO (النجم، ۵۳:۱)	اے محبوب! تیری قسم کہ تو ہی تخلیق کائنات میں سب سے اول تھا اور ظہور میں سب سے آخرO

قسم ہے اے محبوب! تیری کہ تو اول کائنات ہے اور قسم ہے تیری کہ تو آخر کائنات ہے۔ کائنات کا نقطۂ آغاز بھی تو کائنات کا نقطۂ آخر بھی تو، اور اے محبوب! ﷺ قسم ہے تیری کہ تو اپنے فیضانِ رحمت کے ساتھ پوری کائنات پر محیط ہے۔ خلق کی زندگی کا سرچشمہ حیات بھی تو اور حیاتِ خلق کا آخری اشارہ بھی تو اور اے محبوب! درمیان میں تخلیق کی جتنی بھی صورتیں ہیں انہیں تیری رحمت لازوال نے اپنے محیط میں لے رکھا ہے۔ فرمایا:

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَO (الانبیاء، ۲۱:۱۰۷)	اور اے محبوب! ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہےO

اے محبوب! ﷺ پہلے ہم نے آپ کو سراپا رحمت بنایا، پھر اس عالم رنگ و بو کی تخلیق ہوئی، آپ کائنات کی تخلیق سے پہلے بھی موجود تھے اور کائنات کے بعد بھی رہیں گے۔ حضور ﷺ کے اول کائنات آخر کائنات اور محیط کائنات کی تینوں قسمیں نجم کے تین حروف میں مضمر ہیں۔

وَالنَّجمِ إِذَا هَوٰی کا دوسرا معنی:

ظاہری و باطنی کمالاتِ مصطفوی کا ظہور

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ عربی زبان ادب میں لفظ **نجم** کبھی بطور اسم استعمال ہوتا ہے اور کبھی بطور مصدر۔ ہم نے یہ بھی وضاحت کی تھی کہ اگر یہ لفظ بطور اسم آئے تو اس کا معنی درخشاں ستارہ ہوتا ہے اور اگر بطور مصدر آئے تو یہ لفظ طلوع وظہور کے معنی دیتا ہے۔ جب **نجم** کو بطور اسم لیں اور ھو ی کا معنی طلوع وظہور ہو تو آیت کریمہ کا مفہوم کچھ اس طرح ہوگا: قسم ہے اس چمکتے ہوئے ستارے محمد ﷺ کی جو شب معراج مطلع کائنات پر اس طرح طلوع ہوا کہ اس کے سارے ظاہری اور باطنی کمالات منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو گئے۔

حضور ﷺ کو النجم کیوں کہا گیا؟

محبت کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ یہ اپنے اظہار کے راستے خود تلاش کر لیتی ہے۔ یہاں بھی ایک نکتہ محبت کا بیان بے جا نہ ہوگا۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا کہ حضور ﷺ کا سفر معراج کوئی معمولی واقعہ نہیں کہ اسے ایک واقعہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ واقعہ ارتقائے انسانی کا فلسفہ بیان کر رہا ہے اور انسان کو عظمتوں اور رفعتوں سے ہمکنار کر رہا ہے۔ یہ واقعہ حیات مقدسہ کا سب سے بڑا اعجاز تھا۔ ہم اپنی مادی زندگی میں لمحات مسرت کے موقع پر اپنے بچوں کے لئے آنکھ کا تارا، نظر کا نور جیسے الفاظ استعمال کر کے ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں پر اظہار مسرت وتشکر کرتے ہیں۔ شب معراج جب حضور رحمت عالم ﷺ پر انعامات خداوندی کی بارش ہوئی، عظمت و

رفعت کی خلعت فاخرہ عطا ہوئی تو قدرتی طور پر حضورﷺ کی مسرت و انبساط کی کوئی انتہا نہ تھی لیکن عظمت کے اس سفر پر روانہ ہونے پر آپ کو محبت بھرے الفاظ سے حرف تحسین پیش کرنے والا کوئی نہ تھا۔ نہ آپﷺ کے والد گرامی زندہ تھے اور نہ والدہ مکرمہ، دادا جان بھی داغ مفارقت دے گئے تھے، شفیق چچا بھی اب اس دنیا میں نہیں تھے، اب شہر مکہ میں دو ہی گروہ رہ گئے تھے، ایک جاں نثاران مصطفیٰﷺ کا گروہ اور دوسرا کفار و مشرکین کا گروہ، جو آپ کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ آپ کو دنیا میں چمکتا ہوا ستارہ کہہ کر پکارنے والا کوئی نہ تھا۔ فرمایا محبوب! کوئی بات نہیں ہم جو تجھے ''وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰی'' کہہ کر پکارنے والے ہیں۔ قسم ہے اس ستارے کی جب وہ آن بان سے طلوع ہوا۔ اللہ نشاندہی کر دیتا تو بات محدود ہو کر رہ جاتی، اللہ نے مطلع مشرق کا ذکر کیا نہ مطلع مغرب کی طرف اشارہ کیا بلکہ مطلقاً فرما دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اے محبوب! ہم نے جتنے عالم پیدا کئے ہیں تو ہر ہر عالم کے مطلع پر طلوع ہوتا رہا، اس لئے کہ ہم نے تجھے رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے اور تیری شان رحمت یہ ہے کہ کائنات کی ہر شئے تیرے محیط میں مانند حباب بن کر رہے۔ بقول اقبالؒ:

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

فاران کی چوٹیوں پر آفتاب رسالت چمکا تو ہر شئے سیل رنگ و نور میں نہا گئی۔ ظلمت شب سامان سفر سمیٹ کر رخصت ہوئی۔ قانون فطرت ہے کہ جب خورشید افق کے اس پار نظروں سے اوجھل رہتا ہے اور افق عالم پر اس کا ظہور نہیں ہوتا تو اس کی ساری ضوفشانیاں اس کی ساری تابانیاں انسانی آنکھ سے اوجھل رہتی ہیں لیکن جونہی وہ افق عالم پر جلوہ گر ہوتا ہے گوشہ گوشہ منور ہو جاتا ہے۔ یہاں اس نکتے کی وضاحت

ضروری ہے کہ کسی چیز کا وجود اس کے ظہور کے بغیر بھی ممکن ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ہماری چشم بینا سے مخفی رہے یا عقل ناقص کے حیطہ ادراک میں نہ آ سکے۔ آفتاب کے ظہور کے لئے اس کا طلوع ہونا ضروری ہے۔ طلوع کے بغیر ظہور ممکن نہیں چنانچہ جب آفتاب رسالت طلوع ہوا تو یہ نبی آخرالزماں ﷺ کا ظہور تھا، اسی لئے اس لمحہ جاوداں کو ظہور قدسی کا نام دیا گیا ہے۔ طلوع و ظہور کے تناظر میں **النجم** کا مفہوم کچھ اس طرح متعین ہوسکتا ہے کہ قسم ہے اس چمکتے ہوئے ستارے محمد ﷺ کی جو شب معراج اس طرح جلوہ گر ہوا کہ اس کے سارے کمالات عالم بشریت پر اس طرح عیاں ہوئے کہ عالم میں پہلے انہیں کسی نے دیکھا تھا اور نہ کبھی بعد میں آنے والے زمانوں میں دیکھ پائیں گے۔ اس چمکتے ہوئے ستارے نے من کے اندر بھی روشنی بکھیری اور من کے باہر بھی ہر چیز کو منور کر دیا کہ صدیوں کی ظلمتوں کو رخت سفر باندھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ سرور کائنات ﷺ کائنات کا حرفِ یقین ٹھہرے۔ ساری کائنات اسی پیکر جمال کی دریوزہ گر ہے، اسی در سے نور کی خیرات لیتی ہے۔ دہلیز مصطفیٰ ﷺ پر نور کا باڑا بٹتا ہے اور کشکول آرزو میں رحمت کے سکے گرتے ہیں۔ یہ چمکتا ہوا ستارہ بیت المقدس کے افق پر طلوع ہوا تو آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہم السلام تک تمام انبیاء اس مرکز انوار سے اکتساب نور کرنے کے لئے صف بہ صف جمع ہو گئے۔ اس نیر تاباں کی روشنی اکناف عالم میں پھیل گئی، جس نے عالم بشریت کو اپنی آغوش کرم میں سمیٹ لیا۔ قیصر و کسریٰ کا غرور خاک میں مل گیا، قریہ جبر پر ابر رحمت کھل کر برسا، انسان کی خدائی سے انسان کو رہائی ملی، دختر حوا کے پیروں کی زنجیریں ٹوٹ کر گر پڑیں، ظلم و استبداد کے دور کا خاتمہ ہوا، انسانی حقوق کی بازیابی کا عمل مکمل ہوا، افق عالم پر دائمی امن کا عہد نامہ تحریر ہوا، نفاذ عدل انسانی معاشروں کا طرۂ امتیاز ٹھہرا اور جنگل کی ساری تاریکی انسانی معاشروں سے

ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئی اور انسانیت کا شفاف چہرہ آئینے کی طرح چمکنے لگا۔

وَالنَّجۡمِ إِذَا هَوٰى میں مخفی حقائق

وَالنَّجۡمِ إِذَا هَوٰى کا پہلا معنی بلندیوں تک پہنچنا ہے۔ معراج کی شب حضور ﷺ اپنے وجود بشری کے ساتھ ان بلندیوں سے بھی آگے تشریف لے گئے جن بلندیوں پر جبرئیل جیسے مقرب فرشتے کے بھی پر جلتے ہیں۔ کلام خدا پر جتنا بھی غور کیا جائے تفہیم کی نئی نئی پرتیں خود بخود سامنے آتی جاتی ہیں۔ اگر **والنجم** سے حضور ﷺ کا وجود مسعود مراد لیا جائے اور لفظ هَوٰى هَوِیٌّ سے مشتق ہو تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا ''چمکتے ہوئے ستارے محمد ﷺ کی قسم جو زمین کی پستیوں سے ابھر کر عالم لامکاں کی بلندیوں کی انتہاء تک پہنچا''۔ حقیقت معراج روز روشن کی طرح واضح ہو رہی ہے۔ اب اس استدلال کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یہ کسی خواب کی کیفیت بیان نہیں ہو رہی بلکہ روح کا جسم کے ساتھ آسمانوں پر جانا ہی معراج ہے۔ اس کا ذکر ربّ کائنات نے قسم کھا کر کیا ہے کہ یہ واقعہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ **بحالت خواب روحانی معراج کی مطلقاً کوئی ضرورت نہ تھی اور نہ ربّ کائنات کو قسم کھانے کی ضرورت تھی کہ خواب میں تو اس قسم کے محیر العقول مشاہدات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اللہ ربّ العزت کا قسم کھانا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ واقعہ غیر معمولی نوعیت کا ہے۔**
اگر اس سے یہ مراد لی جائے کہ حضور ﷺ سدرۃ المنتہی سے واپس لوٹ آئے (جیسا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے) تو پھر بھی یہ واقعہ اتنی اہمیت کا حامل نہ ہوتا کہ سدرۃ المنتہی تک تو جبرئیل کو بھی رسائی حاصل ہے۔ سدرۃ المنتہی عالم ملوکیت کی آخری حد ہے، جہاں شہداء اور خدا کے برگزیدہ بندوں کا گزر رہتا ہے، لہٰذا سدرۃ المنتہی تک پہنچنا اتنی عظیم

بات نہ ہوتی اور اسے اس اہتمام سے بیان بھی نہ کیا جاتا لیکن بات سدرۃ المنتہی سے آگے کی ہے۔ خدائے بزرگ و برتر کے قسم کھانے سے اس استدلال کو تقویت ملتی ہے کہ حضور ﷺ پروردگار عالم کی عطا کردہ قوت سے عالم بالا کے اس آخری کنارے تک پہنچے جہاں کوئی نبی مرسل یا فرشتہ پہنچنے کی نہ تاب رکھتا ہے اور نہ جرات، وہاں تک مرغ تخیل کی رسائی بھی ممکن نہیں۔

لفظ ھَوٰی سدرۃ المنتہی سے قاب قوسین تک کے سفر کو بیان کر رہا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس لمحہ کی قسم جب میرے محبوب تو لامکاں کی حدوں کو پار کر کے میرے مقام قرب تک پہنچا۔ خلاصہ بحث یہ ہوا کہ خدائے علیم وخبیر نے اس آیت مقدسہ میں اس چمکتے ہوئے ستارے محمد ﷺ کی قسم کھائی جو شب معراج عظمتوں اور رفعتوں سے ہمکنار ہوئے بلکہ سب رفعتوں اور عظمتوں کو اپنے قدموں کے نیچے چھوڑتے ہوئے بلندیوں کی آخری منزل تک جا پہنچے۔ اس منزل تک جس منزل تک عام انسان تو کجا فرشتوں تک کے پہنچنے کا تصور بھی محال ہے۔

سفرِ معراج کا نقطۂ آغاز اور منتہائے کمال

طائف کے بازاروں میں اوباش لڑکوں کی سنگ باری کا دلخراش سانحہ گزر چکا تھا، مکہ مکرمہ میں حضور ﷺ کی واپسی کے مقفل دروازے کھل چکے تھے۔ قلب اطہر کفار ومشرکین مکہ کی مسلسل چیرہ دستیوں پر ملول تھا لیکن لب اقدس پر دعا کے پھول کھل رہے تھے۔ تحریک اسلامی کی قیادت عظمیٰ آزمائش کے مراحل سے گزر چکی تھی۔ دلجوئی کے لئے نہ عبدالمطلب تھے نہ ابوطالب، اللہ ربّ العزت نے اپنے محبوب کی دلجوئی اس طرح کی کہ انہیں عظمتوں اور رفعتوں کی اس منزل تک لے گیا جس کا تصور بھی ذہن

انسانی میں نہیں سما سکتا۔ سدرۃ المنتہی کی وہ منزل جس سے آگے جبرئیل جیسے مقرب فرشتے کو بھی دم مارنے کی جانہیں، آپ کے سفر معراج کا ایک پڑاؤ ٹھہری۔

اس سفر عظیم کا آغاز حطیم کعبہ سے ہوا۔ آقائے کائنات استراحت فرما تھے۔ ادھر آسمانوں پر حور و ملائکہ محبوب کبریا کی پیشوائی کے منتظر تھے کہ سرکار ﷺ تشریف لائیں اور وہ آسمانی مخلوق حضور ﷺ کی راہوں میں اپنی آنکھیں بچھانے کا اعزاز حاصل کرے۔ جبرئیل امین آسمانوں سے اترے، حضور رحمت عالم ﷺ کو بیدار کیا اور ایک سواری حاضر کی، جو دراز گوش سے اونچی اور خچر سے قدرے نیچی تھی۔ اس سواری کا نام ''براق'' تھا۔ حضور ﷺ اس پر سوار ہوئے۔ یہ ایک تیز رفتار سواری تھی۔ اس کی تیز رفتاری کا عالم یہ تھا کہ اس کا ہر ہر قدم منتہائے نظر پر پڑتا تھا۔ سفر کے پہلے مرحلے پر تاجدار کائنات ﷺ بیت المقدس لے جائے گئے جہاں تمام انبیاء آپ کے منتظر تھے۔ نماز کا وقت ہوا، صفیں درست ہوئیں اور جبرئیل نے حضور ﷺ کو انبیاء کی امامت کے لئے مصلیٰ پر کھڑا کر دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک ......تمام انبیائے کرام نے سردار انبیاء کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ یہاں سے براق پر سوار ہو کر آپ نے آسمان دنیا پر ورود فرمایا۔ آسمان دنیا کے دروازے پر جبرئیل امین نے دستک دی تو دربان نے پوچھا کہ جبرئیل تمہارے ساتھ کون ہے؟ جب جبرئیل نے آپ ﷺ کا اسم گرامی لیا تو دروازہ کھل گیا۔ حور و غلمان صف بہ صف کھڑے تھے۔ خوش آمدید یارسول اللہ! ﷺ خوش آمدید، مرحبا یا نبی مرحبا۔ پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، آپ نے نسل انسانی کے جد امجد کو سلام کیا تو حضرت آدم علیہ السلام نے صالح بیٹے اور صالح نبی کہہ کر نبی آخر الزماں ﷺ کا استقبال کیا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے ساتوں آسمانوں کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ عرش معلیٰ پر جشن کا سا

سماں تھا۔ ہر طرف حضورﷺ کی آمد کے چرچے تھے۔ آج وہ مہمان ذی وقار آ رہے ہیں جن کے بارے میں ربّ کائنات نے فرمایا کہ اے محبوب!ﷺ اگر تجھے پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو یہ زمین ہوتی اور نہ یہ آسمان، پیارے یہ کائنات رنگ و بو تیرے قدموں کا صدقہ ہے، یہ زمین وآسمان تیرے نقوش پا کی خیرات ہے۔ فرشتے جوق در جوق استقبال کے لئے حاضر ہوتے رہے۔ کائنات ارض وسماوات عالم بشریت کی زد میں تھی۔ حضورﷺ عظمتوں اور رفعتوں کا یہ عظیم سفر طے کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ عروج آدم خاکی سے سہمے ہوئے **النجم** بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ دوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں آسمان پر آپ کی ملاقات بالترتیب حضرت یحییٰ وعیسیٰ، حضرت یوسف، حضرت ادریس، حضرت ہارون، حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیھم السلام سے ہوئی۔ گویا آپ جہاں گئے انبیاء سے فرشتوں تک تمام آسمانی مخلوقات آپ کے لئے چشم براہ تھیں۔ سدرۃ المنتھی کا مقام بلند آ گیا۔ جبرائیل علیہ السلام رک گئے اور آگے بڑھنے سے معذوری کا اظہار کیا:

لو دنوت انملة لاحترقت— اگر ایک پور برابر بھی آگے بڑھوں تو جل جاؤں گا۔

(روح البیان، تفسیر نیشاپوری)

(الیواقیت والجواہر، ۲: ۳۵)

یارسول اللہ!ﷺ اس سے آگے جانے کی مجھے اجازت نہیں۔ آگے بڑھا تو میرے پر جل جائیں گے۔ حضورﷺ تن تنہا بڑھتے ہوئے آخر اس مقام پر پہنچ گئے جس کو **قاب قوسین او ادنی** سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سارے حجابات اٹھا دیئے گئے۔ قرآن کہتا ہے:

ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی o فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی o فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰیo
(النجم،۵۳:۸-۱۰)

پھر قریب ہوا (اللہ محمد ﷺ سے) پھر زیادہ قریب ہوا تو (محمد ﷺ اپنے ربّ سے) o دو کمانوں کی مقدار (نزدیک) ہوئے بلکہ اس سے (بھی) زیادہ قریب o تو وحی فرمائی اپنے عبد مقدس کو جو وحی فرمائی o

حدیث پاک میں مذکور ہے:

حتی جاء سدرة المنتھی دنی الجبار ربّ العزة فتدلی حتی کان منه قَابَ قَوْسَیْنِ أَوْ أَدْنٰی
(صحیح البخاری،۲:۱۱۲۰)

یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہی پر آ گئے، ربّ العزت اپنی شان کے لائق بہت ہی قریب ہوا یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔

اللہ ربّ العزت نے اپنی شان کے مطابق اپنے محبوب ﷺ کو خوش آمدید کہا اور اتنا قریب ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب ﷺ کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا۔ گویا حضور رحمت عالم ﷺ پر پروردگار عالم کے جلووں کی ارزانی ہوئی۔ بارگاہ صمدیت میں تاجدار کائنات حضور رحمت عالم ﷺ سرتاپا صفات ربانی میں اس طرح رنگے گئے کہ آپ ﷺ کی ذات ستودہ صفات اللہ تعالیٰ کی مظہریت کا پیکر اتم بن گئی۔

لامکاں کی وسعتوں سے زمین پر نزول

اللہ ربّ العزت نے آسمانوں پر اپنے محبوب رسول ﷺ کو خلعت عظمت و رفعت سے نوازا، انہیں ان بلندیوں پر فائز کیا جن کا تصور بھی محال ہے۔ طائف کے

بازاروں میں سنگ باری نے محبوب ﷺ کو ملول کر دیا۔ ربّ کائنات نے اپنے محبوب ﷺ کی دلجوئی فرماتے ہوئے آپ کا دامن عظمتوں اور رفعتوں سے بھر دیا اور آپ ﷺ کے منصب رسالت کو نئی شان عطا کی۔

عربی زبان و ادب کے قواعد کے مطابق اگر لفظ ھَوٰی مصدر ھُوِیٌّ سے مشتق ہو تو اس کا معنی ہوگا: الخذار، نزول، نیچے آنا۔ ان معانی کی رو سے اس آیت مقدسہ کا مفہوم یہ ہوگا:

والنجم ای محمد اذا هوى ای اذا نزل من السماء الی الارض ليلة معراج—	قسم ہے اس چمکتے ہوئے ستارے محمد ﷺ کی جو شب معراج انتہائی رفعتوں کو چھو کر زمین پر واپس آ گیا۔

(الشفاء، ۱:۱)

مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور پھر مسجد اقصیٰ سے آسمانوں تک کا سفر بھی ایک معجزہ تھا اور عظمتوں اور رفعتوں سے ہمکنار ہونے کے بعد واپس اس کرۂ ارضی پر تشریف لے آنا بھی ایک معجزہ تھا۔ حضور ﷺ کی معراج کا پہلوئے بشریت عالم بشریت کو فیض پہنچانے کے لئے تھا کہ آپ کو نسل انسانی کی رشد و ہدایت کے لئے جامۂ بشریت میں مبعوث فرمایا گیا جبکہ نورانیت کا پہلو عالم ملکوت کی فیض رسائی کے لئے تھا۔ یہ دونوں پہلو فی الحقیقت حضور رحمت عالم ﷺ کے حقیقی مقام کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ آپ کی حقیقت، نورانیت و بشریت کے مقامات سے وراء الوراء ہے۔ اس سے ان لوگوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں جو نور و بشر کے مسائل میں الجھ کر خوامخواہ آپس میں دست و گریباں ہیں۔

حضورﷺ مقام بشریت کو بیت المقدس میں چھوڑ گئے اور مقام نورانیت کو عالم ملکیت میں چھوڑ کر آگے گزر گئے۔ حقیقت محمدی ان دونوں مقامات کی انتہاء سے بھی بالاتر ہے۔ آپ کا اصلی گھر تو لامکاں تھا جہاں پر آپ کو مدعو کیا گیا تھا۔ یہ خالق موجودات کا ہم بندگان خاکی نہاد پر عظیم احسان ہے کہ اس نے اپنے لطف وکرم اور عنایت سے اپنے محبوبﷺ کو اپنی صفات کا مظہراتم بنا کر ہمیں عطا کر دیا۔ حضورﷺ زمین پر واپس آ گئے تا کہ زمین پر بسنے والی اولاد آدم کو ظلم و بربریت سے نجات دلائیں۔ دنیا امن وسکون کا گہوارہ بن جائے اور انسانی معاشروں میں عدل کے نفاذ کو یقینی بنایا جائے تا کہ انسانی معاشرے استحصال کی ہر شکل سے پاک ہو جائیں۔

صوفیاء کی تعبیر معراج

صوفیاء کے نزدیک تاجدار کائنات حضور نور مجسمﷺ کا معراج کے لئے اس کرۂ ارضی کی پستی سے عالم بالا کی طرف جانا اتنا بڑا معجزہ نہیں جتنا کہ مقامات علو سے دامن کش ہو کر جہان آب وگل کی پستی کی طرف لوٹ آنا ہے۔ اسی سبب سے **والنجم** کہہ کر ربّ کائنات قسم کھا رہا ہے اس چمکتے ہوئے ستارے محمدﷺ کی جو اس کی حریم ذات کے قرب وصال کی رفعتوں سے ہمکنار ہونے کے بعد نوع انسانی کی بھلائی، اولاد آدم کی بہبود اور انسانی ہدایت کی خاطر واپس زمین پر تشریف لے آئے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے اس مقام پر صوفیاء کے دو مراتب کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ مرتبۂ عروج   ۲۔ مرتبۂ نزول

۱۔ مرتبۂ عروج

عروج وہ مرتبہ ہے جس میں روح اپنے اصل وطن کی طرف لوٹ جاتی ہے

اور لذت وصال سے ہمکنار ہو کر ہجر و فراق کے مرتبہ کی طرف لوٹ آتی ہے۔ عرفاء کے نزدیک عروج کا درجہ نزول کے درجے سے کم ہے اس لئے کہ عروج تکمیل کا سفر ہے جبکہ نزول اپنے تکمیل کے بعد دوسروں کی تکمیل کا متقاضی ہے اور یہ مرحلہ پہلے مرحلے کی نسبت آزمائش طلب، پرکٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے۔ شیخ گنگوہیؒ کے ارشاد کے مطابق حضور سرورِ کون و مکاں ﷺ کا کمال تھا کہ وہ اس رفعتِ أَوْ أَدْنٰی سے واپس لوٹ آئے۔ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے وہاں جانا نصیب ہوتا تو واپس آنے کا کبھی نام نہ لیتا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک تو مجھ میں اتنی روحانی توانائی نہ ہوتی کہ میں اپنی جسمانی اکائی کو برقرار رکھ سکتا۔ دوسرے اپنی ذات میں اس قدر مگن ہو جاتا اور خود غرضی مجھ پر اس قدر غالب آ جاتی کہ میں عالم انسانیت کو بھول کر صرف اپنا ہی ہو کر رہ جاتا لیکن حضور ﷺ کی عظمت یہ ہے کہ وہ اتنی بلندیوں پر پہنچنے کے بعد لوٹ آئے۔ شعور بندگی اور احساس بندگی ہر قدم پر دامن گیر رہا، چنانچہ آپ ﷺ عظمتوں کی خلعت فاخرہ عطا ہونے کے بعد بھی اپنی ذات میں گم نہیں ہوئے بلکہ انہیں ہر لمحہ ہم گنہگاروں کی ہدایت اور اصلاح کا خیال رہا۔ آپ ﷺ اتنی روحانی قوتوں کے مالک تھے کہ انوار و تجلیات کی مسلسل بارش میں اپنی ذات کی اکائی کو سلامت رکھنے میں کامیاب و کامران رہے اور واپس زمین کی طرف بھی لوٹ آئے کہ اس کرۂ ارضی پر بسنے والے انسانوں کو اصنام پرستی کے تاریک غاروں سے نکال کر توحید پرستی کے حلقۂ انوار میں داخل کرنا تھا۔ یہ وہی زمین تھی جہاں پتھروں کی بارش میں بھی آپ ﷺ نے پرچم توحید اٹھائے رکھا۔ جہاں قدم قدم پر آپ کے خون کے پیاسے آپ کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ شان رسالت یہی تھی کہ اللہ کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے اور اس کی

تائید ونصرت پر کامل یقین رکھتے ہوئے دلوں کے قفل توڑے جائیں اوران کے سینوں کوتوحید کے نور سے منور کیا جائے۔

پیکرِ جودوکرم کا احسان

اگر تاجدار کائنات ﷺ اللہ ربّ العزت کی بارگاہ میں یہ عرض گزارتے کہ باری تعالیٰ میں نے منزل مقصود کو پالیا۔اس سے آگے کی منزل کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔اب دنیا میں جا کر مجھے کیا لینا، بس تیرے انہی جلووں میں گم ہو جانا چاہتا ہوں، مولا! واپسی کا کوئی ارادہ نہیں، تو کیا وہ مہربان خدا جس نے اپنے بندے اور رسول ﷺ کو عظمتوں اور رفعتوں سے ہمکنار کیا ہے، اپنے قرب کے اعزاز لازوال سے نوازا تھا، اپنے محبوب ﷺ کی بات کو رد کر سکتا تھا؟ ہرگز ہرگز نہیں، لیکن آقا حضور ﷺ نے ہم غلاموں کو دشت بے اماں میں بھٹکنے کے لئے تنہا نہیں چھوڑا اور واپس ہمارے درمیان تشریف لے آئے۔ جہاں ہم نے نفرت کی دیواریں کھینچ رکھی تھیں۔کفر وشرک کے حصار میں مقید اولادآدم خدا پرستی کی ہرادا کو بھول چکی تھی، جہاں زندگی شرمندگی کا روپ اختیار کرکے ضمیر مردہ کا کفن اوڑھ چکی تھی۔

اقلیم تصوف میں روحانیت اور طریقت میں معراج عروج پرختم ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں مقصود اپنی ذات کا کمال ہوتا ہے مگر یہاں تو امت کو باکمال کرنا مقصود تھا لہٰذا باری تعالیٰ کے پیار بھرے سوال کا جواب انتہائی عاجزی سے عرض کیا کہ باری تعالیٰ واپس جانا چاہتا ہوں۔اس طرح معراج مصطفوی کا سفر عروج کی بجائے نزول پرختم ہوا کیونکہ اگر نزول نہ ہوتا تو امت بے وسیلہ ہو جاتی اور اپنے نبی ﷺ کا فیض نہ پا

سکتی لیکن آقائے نامدار ﷺ کو ہماری بہتری اور بھلائی مقصود تھی۔ یہ حضور ﷺ کا امت اجابت (امت مسلمہ) پر ہی نہیں پوری امت (بشمول امت دعوت) پر احسان عظیم ہے کہ انہوں نے عالم انسانیت کو ایک ایسی محرومی سے بچا لیا جس کی تلافی حشر تک ممکن نہ ہوئی۔

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰی کا تیسرا معنی...... پورے سفر معراج کی قسم

سطور بالا میں ہم نے آیت مقدسہ کے دو معانی تفصیلاً بیان کئے ہیں۔ اس آیت مقدسہ کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ ربّ کائنات نے پورے سفر معراج کی قسم کھائی ہے۔ عربی زبان ولغت کے قواعد کے مطابق کسی چیز کے اوپر جا کر نیچے آنے کے پورے عمل کو بھی ھوی کہتے ہیں۔ اس معنیٰ کی رو سے اللہ ربّ العزت اپنے محبوب ﷺ کے پورے سفر معراج کی قسم کھا رہا ہے۔ اب اس آیت مقدسہ کا مفہوم یوں ہوگا کہ قسم ہے ستارے کی طرح چمکتے ہوئے وجود مبارک کی جو شب معراج اوپر گیا اور اپنی منزل مقصود پا کر پھر واپس آ گیا یعنی آپ ﷺ نے آسمانوں کی سیر اور عظمتوں سے ہمکنار ہونے کے بعد دوبارہ عالم انسانیت میں نزول فرمایا۔

قرآنی قسموں کی حکمتیں

قرآن مجید میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے کئی مقامات پر قسم کھائی ہے۔ قسم کسی خاص واقعہ کی اہمیت کو اجاگر کرنے اور ذہن انسانی میں اس کا نقش بٹھانے کے لئے اٹھائی جاتی ہے۔ اللہ ربّ العزت کے اپنے پیارے رسول کی قسم کھانے میں کئی حکمتیں، احوال اور رمزیں ہیں، کئی اسرار و رموز ہیں جن پر سے پردہ اٹھانا مقصود ہے۔ یہاں ہم

بیشمار حکمتوں میں سے ایک پہلوئے محبت کو لے رہے ہیں، وہ یہ کہ اس آسمانی سفر پر تاجدار کائناتﷺ خود نہیں گئے بلکہ اللہ ربّ العزت کی طرف سے جبرئیل امین بلاوا لے کر آئے تھے کہ اے محبوب!ﷺ آج میں چاہتا ہوں کہ مقام قاب قوسین میں اپنے حسن مطلق کی جلوہ گاہ میں بٹھا کر تجھے دیکھوں اور تو میرے محبوب! جی بھر کر میرے حسن مطلق کے نظارے کرے۔ محبوب میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ آج قاب قوسین پر میرے سوا تجھے تکنے والا کوئی نہ ہو اور تیری نگاہوں کے سوا میرے حسن مطلق کے جلوے کرنے والا کوئی دوسرا نہ ہو، تو تو ہو اور میں میں ہوں اور تیسرا کوئی نہ ہو۔ چونکہ خدائے لم یزل کی طرف سے حضورﷺ کو مقام قاب قوسین پر لے جایا جا رہا تھا اس لئے فرمایا:

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰی۔

دستور محبت بھی ہے اور ضابطۂ وفا بھی کہ جو لوگ عشق و محبت کی لذتوں، حلاوتوں اور سرشاریوں سے آشنا ہوتے ہیں، وہ اس حقیقت کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ اگر کسی سے محبت ہو اور محبوب ملنے کے لئے آ رہا ہو تو اس کا ملنے کے لئے آنا بھی اتنی بھلی، پسندیدہ اور دل کو موہ لینے والی ادا ہوتی ہے کہ محبّ دیکھ کر لطف اندوز ہوتا رہتا ہے اور اس کے جسم کا بال بال ٹھنڈک محسوس کرتا ہے اور زبان حال سے یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ قربان جاؤں کہ کتنی پیاری ادا کے ساتھ تو میری طرف آ رہا ہے اور حرف تحسین بے ساختہ اس کے لبوں پر مچل اٹھتے ہیں۔ محبّ اپنے محبوب کی ہر ادا پر مچل اٹھتا ہے، نثار ہو ہو جاتا ہے، اس کا انگ انگ ان لمحات مسرت میں سراپا دید بن جاتا ہے اور جب محبوب واپس ہونے لگتا ہے تو اشتیاق سے اسے دیکھتا ہے۔ دیکھو میرا محبوب جب آیا تو اس کی چال میں کتنا وقار تھا، اب جا رہا ہے تو اس کی چال میں کتنی تمکنت ہے۔ یہ تو

ہمارے پیمانہ ہائے محبت ہیں۔ بلاتمثیل وتشبیہہ اللہ ربّ العزت بھی اپنے محبوب ﷺ کی آمد اور واپسی کی قسمیں کھا رہا ہے۔ قسم ہے تیری اے چمکتے ہوئے ستارے! إِذَا هَوٰى، جب تو میرے بلاوے پر میرے حسن مطلق کی جلوہ گاہ میں آیا۔ تیرا آنا کتنا بھلا لگ رہا تھا اور اے میرے دمکتے ستارے! تیری قسم جب تو قاب قوسین پر ان عظمتوں اور رفعتوں سے ہمکنار ہو کر میری ذات وصفات کے انوار وتجلیات کو اپنے دامن میں سمو کر واپس جا رہا ہے۔ تیرے واپس جانے کی شان، ڈھنگ، انداز اتنا دلکش تھا کہ تیرے لوٹ کر جانے پر بھی پیار آ رہا تھا۔ تیرا آنا اور جانا دونوں لاجواب تھے۔

قسم اس سرزمین کی جس نے تیرے قدموں کو بوسہ دیا

جب انسان قسم اٹھاتا ہے تو اس کی یہ قسم عشق کی حلاوتوں اور شیرینیوں پر دلالت کرتی ہے اور جب اللہ ربّ العزت قسم اٹھاتا ہے اور وہ بھی اپنے محبوب بندے اور رسول کی تو اس کی اہمیت کا اندازہ لگانا بھی بندوں کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ اگر راز محبت درمیان میں نہ ہو تو خدا کو کیا پڑی ہے کہ وہ اپنے بندے کی جو اس کی تخلیق ہے کے آنے جانے کی قسم کھائے۔ یہ وہی محبت اور شفقت کے راز ہائے سربستہ ہیں جن کا قرآن میں ذکر مذکور ہے کہ اے محبوب! مجھے قسم ہے اور شہر دلنواز کی جس کی گلیوں میں تو چلتا پھرتا ہے۔

لاَ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِo وَ اَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِo	میں اس شہر (مکہ) کی قسم کھاتا ہوںo کہ آپ اس شہر میں رہتے ہیںo

(البلد، ۹۰:۱-۲)

فرمایا جارہا ہے کہ محبوب میں شہر مکہ کی قسم اس لئے کھاتا ہوں کہ یہ تیرا شہر ہے

ورنہ مجھے کیا پڑی کہ میں کسی شہر کی قسم کھاتا پھروں۔ میں تو ساری زمین کا مالک ومختار ہوں۔ میں تو زمینوں، آسمانوں، سورج، چاند، ستاروں سب کا خالق ہوں، میں کرۂ ارضی کے کسی خاص ٹکڑے کی قسم کیوں کھاؤں۔ میں کسی چاند یا ستارے کی قسم کیوں کھاؤں، یہ تو سب میری مخلوقات ہیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ میری حمد بیان کرتا ہے، میری ذات کے گرد مصروف طواف رہتا ہے۔ اگر سرزمین مکہ میں کعبہ ہے تو کیا ہوا، یہ تمہارے لئے باعث برکت ہوسکتا ہے، میرے لئے تو یہ محض مخلوقات میں سے ایک ہے۔ اگر شہر مکہ میں صفا اور مروہ ہے تو بھی کیا ہوا! حضرت حاجرہ علیہا السلام کے نقوش پا ہی کو چومنے سے ان کو یہ عظمت ملی۔ یہ تمہارے لئے مقدس پہاڑیاں ہوسکتی ہیں لیکن میرے لئے ان کی حیثیت ریت کے ٹیلوں سے زیادہ نہیں۔ اگر شہر مکہ میں چاہ زم زم ہے تو یہ بھی میرے لئے ایک کنواں ہی ہے جو تمہارے لئے باعث فضیلت ہوسکتا ہے۔ میری ذات تو ان چیزوں سے ماوراء ہے۔ حطیم اور غلاف کعبہ تمہارے لئے خیر و برکت کا موجب ہیں لیکن میری ذات تو کسی چیز کی محتاج نہیں۔ مگر میں پھر بھی اس شہر کی قسم اٹھاتا ہوں، اس کی وجہ کعبہ ہے نہ مطاف و زمزم، یہاں ہزاروں انبیاء کے مزارات ہیں لیکن یہ بھی میری قسم کا سبب نہیں بن سکتے۔ آ محبوب! تجھے بتاؤں کہ میں شہر مکہ کی قسم کیوں کھاتا ہوں۔ محبوب! اس لئے کہ یہ تیرا شہر ہے۔ اس سرزمین نے تیرے قدموں کو بوسہ دینے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ یہ ریگ رواں تیرے تلوؤں کا دھوون پینے کی سعادت سے سرفراز ہوئی ہے۔ اس شہر کی قسم اس لئے کھاتا ہوں کہ محبوب تو ان گلیوں میں چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ مجھے یہ گلیاں پیاری لگتی ہیں کہ یہ تیری پذیرائی کے لئے چشم براہ رہتی ہیں۔ محبوب! تو چلتا ہے تو یہ تیری راہ میں عقیدت کا آنچل بچھا دیتی ہیں۔ اس

شہر میں محبوب تیرا گھر ہے۔ یہ تیرے پیدا ہونے کی جگہ ہے۔ اسی شہر مکہ میں صبح میلاد ثویبہ نے تیری آمد کا مژدہ سنا کر رہائی پائی تھی کہ آج ساری انسانیت کا نجات دہندہ پیدا ہوا ہے۔ ان ہواؤں نے طشت تمنا میں تیری سانسوں کے گلاب سجائے ہیں۔ ان فضاؤں نے تیرے قدموں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنایا ہے۔ اسی شہر کے در و دیوار نے تیرے جلوؤں کی تابانی کو اپنا جھومر بنایا ہے۔ اس شہر میں تیرا بچپن گزرا، لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا گزرا۔ محبوب! ان فضاؤں میں تیری سانسوں کی خوشبو رچی بسی ہے۔ تیرے لب شیریں کی صدائیں گونج رہی ہیں۔ یہ فضائیں محبوب! تیرے پسینے کی خوشبوؤں سے مہک رہی ہیں۔ ان ہواؤں نے تیرے دامن کو آنکھوں سے لگایا ہے۔ اے شہر مکہ! تو مجھے محبوب ہے اس لئے کہ تو میرے محبوب کا شہر دلنواز ہے۔

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى کا چوتھا معنی: سفرِ معراج کی سرعت رفتاری

ھوٰی تیزی اور سرعت کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے، سفرِ معراج انتہائی تیز رفتار سفر تھا۔ براق برق کی جمع ہے۔ سورج کی روشنی تقریباً 9 منٹ میں زمین پر پہنچتی ہے، روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے، یہ سفر براق اور رفرف پر طے ہوئے۔ ہزاروں لاکھوں روشنیوں کو اگر جمع کر لیا جائے تو براق اور رفرف کی رفتار اس سے بھی تیز ہوگی یعنی سفرِ معراج وہ سفر تھا جو پلک جھپکنے میں نہایت تیزی اور نہایت سُبک رفتاری سے طے ہوگیا۔ اگر ھوٰی سے مراد سُرعت اور تیزی لیا جائے تو آیتِ مقدسہ کا ترجمہ کچھ یوں ہوتا ہے کہ ''قسم ہے اِس ستارے محمد ﷺ کی جو زمین سے اور مکاں کی ساری وسعتیں اور منزلیں طے کرکے اِتنی تیزی اور تیز رفتاری سے زمین کی طرف واپس پلٹا کہ وہ سفر جو کروڑوں سالوں میں بھی طے نہیں ہوتا آنِ واحد میں اِس طرح مکمل ہوا کہ جب وہ (حضور تاجدارِ کائنات ﷺ) واپس آیا تو اُس کے دروازے کی کنڈی اُسی طرح ہل رہی تھی اور غسل و وضو کا پانی اُسی طرح بہہ رہا تھا۔ ''والنجم'' قسم ہے چمکتے ہوئے ستارے محمد ﷺ کی ''اذا ھوٰی'' تیری تیز رفتاری کی کہ تو حطیمِ کعبہ سے اٹھا، پہلے تو نے غسل کیا، وضو کیا، تیرا سینہ مبارک شق ہوا پھر میرے محبوب! ﷺ تو براق پر سوار ہوا، فرشتے تیرے ہمرکاب تھے پھر تیری سواری بیت المقدس پہنچی، تو نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قبرِ انور میں نماز پڑھتے ہوئے بھی دیکھا۔ پھر بابِ محمد ﷺ کے مقام پر جبرئیل علیہ السلام نے انگلی سے براق کو باندھنے کی جگہ کی نشاندہی کی، محبوب! ﷺ پھر تو براق سے نیچے اترا، آدم علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء صف باندھے تیرے منتظر تھے، تو آیا تو نماز میں انبیاء کی امامت کی کہ تو

امام الانبیاء ہے، سردارِ مرسلین ہے۔

بیت المقدس کی زیارت کرنے اور انبیاء کی امامت کرنے کے بعد تیرا آسمانوں کا سفر شروع ہوا، تیرے آنے پر محبوب! ﷺ پہلے آسمان کا دروازہ کھولا گیا۔ انبیاء اور ملائکہ نے نہ صرف خوش آمدید کہا بلکہ تیرے دیدار سے بھی مشرف ہوئے۔ محبوب! ﷺ پھر تیرا نزول دوسرے آسمان پر ہوا، وہاں بھی انبیاء اور ملائکہ دیدہ و دل فرشِ راہ کئے ہوئے تھے، تیسرے اور چوتھے حتیٰ کہ تو ساتویں آسمان پر پہنچا پھر تو محبوب! ﷺ عرشِ معلٰی کی سیر کرتا رہا، آسمانوں نے تیری قدم بوسی کا اعزاز حاصل کیا، ملائکہ تیری راہوں میں آنکھیں بچھا رہے تھے، تمام قدسیوں نے میری بارگاہ میں التجا کر کے تیرا بے حجاب دیدار کیا، جبرئیل سدرۃ المنتہٰی پر رک گیا کہ ایک قدم بھی بڑھتا تو جل جاتا، اب محبوب ﷺ تجھے اکیلے ہی آنا تھا جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں، محبوب! ﷺ تو وہاں بھی تجلیات میں نہا گیا، پھر رفرف کو تجھے اپنا شہسوار بنانے کی سعادت نصیب ہوئی، پھر آگے بہت آگے سدرۃ المنتہٰی سے بھی آگے تو لامکاں کی حدود میں داخل ہو گیا۔

قف یا محمد ان ربک یصلی حبیب! ﷺ تھوڑی دیر کیلئے ٹھہر جا تیرا رب تیرے قریب آ رہا ہے۔

(الیواقیت والجواہر، ۲: ۳۵)

محبوب! ﷺ میں تیرے استقبال میں درود پڑھتا رہا، پھر تو آگے بڑھا، میں اِستقبال میں اپنے شایانِ شان آگے بڑھا، پھر میں نے تجھے اپنے دامنِ قرب میں لے لیا، محبوب! ﷺ پھر میں نے تجھے اپنی لذتِ وصال سے ہمکنار کیا، پھر تجھ پر وحی اتاری، محبوب! ﷺ تو آسمانوں پر آیا تو میں نے تجھ سے دریافت کیا کہ محبوب! ﷺ ہمارے لئے کیا تحفہ لائے ہو؟ تو نے کہا کہ باری تعالیٰ اپنی بندگی اور امت کے گناہوں

کا تحفہ لایا ہوں، محبوب ! ﷺ تیرے اِس جواب پر میں نے تجھ پر سلامتی بھیجی، میں نے تجھے پچاس نمازوں کا تحفہ دیا، پھر راز و نیاز کی باتوں کے بعد تو واپس لوٹا، چھٹے آسمان پر موسیٰ علیہ السلام سے ملا، موسیٰ نے کہا یارسول اللہ ! ﷺ واپس جایئے، آپ کی امت اِتنی نمازیں ادا نہ کرے گی، محبوب ! ﷺ تو لوٹ کر میرے پاس آیا، میں چاہتا تو تو پینتالیس نمازیں بیک وقت معاف کر کے پانچ نمازوں کا تحفہ دے کر تجھے بھیج دیتا اور چاہتا تو شروع ہی میں تجھے دیتا ہی پانچ نمازوں کا تحفہ لیکن بار بار تجھے بھیجتا رہا، موسیٰ سے مل کر تو واپس آتا رہا، محبوب ! ﷺ حکمت یہ تھی کہ نمازیں بخشوانے کے لئے تو بار بار آتا رہے اور محبوب ! ﷺ میں تجھے تکتا رہوں۔ اِس طرح بار بار تیرا آنا جانا رہا، پھر تو آسمانوں کی سیر، جنت اور دوزخ کا نظارہ کرتا ہوا سدرۃ المنتہیٰ کو پیچھے چھوڑتا ہوا آسمان کی بلندیوں سے نیچے کرۂ ارض پر آیا، پھر بیت المقدس کی سمت سے تو مکہ مکرمہ پہنچا تو محبوب ! ﷺ راستے میں تو نے اونٹوں کے قافلے دیکھے اور جب تجھے پیاس محسوس ہوئی تو تو نے پیالے سے پانی پیا۔

میرے محبوب ! ﷺ نے اتنا طویل سفر طے کیا، اِتنی طویل سیر کی، اِتنی طویل گفتگو کی لیکن قسم ہے تیرے سفر کی تیزی کہ کے جب تو واپس آیا تو تیرے وضو کا پانی بھی بہہ رہا تھا، تیرے دروازے کی کنڈی بھی ہل رہی تھی اور تیرا بستر بھی گرم تھا۔عظمتوں اور رفعتوں کے اِس سفر میں حضور ﷺ کو اَن گنت عجائبات بھی دکھائے گئے، اللہ کے فضل وکرم کی گھٹائیں آپ ﷺ کے ساتھ ہمرکاب رہیں، کارخانہ قدرت میں کارکنان قضا وقدر نے وقت کی طنابیں کھینچ لیں، حضور ﷺ کی سرعت رفتار کا یہ عالم تھا کہ ایک ہی جست میں تمام مسافتیں طے ہوگئیں، فاصلے سمٹ گئے اور وقت اُسی نقطے پر ٹھہر گیا جہاں صاحبِ معراج اِسےچھوڑ کر گئے تھے، ایک ہی لمحہ خدا جانے کتنے کروڑ سالوں پر

محیط ہوگیا، کائنات پر ایک پل بھی نہ گزار کہ سیاحِ لامکاںﷺ سب زمانی و مکانی مسافتیں طے کر کے واپس بھی لوٹ آئے، یہ بے نظیر و بے عدیل سفر باوجود اپنی پنہائیوں اور بے کرانیوں کے رات کے ایک پل میں اِس طرح تمام ہوگیا کہ جانے اور واپس آنے میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہ ہوئی۔

اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے۔

عشق کی ایک جَست نے طے کر دیا قصّہ تمام
اِس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

خالق کائنات نے نبضِ ہستی کو روک دیا اور کارخانہ، عالم کی حرکت پذیری کو موقوف رکھا اس وقت تک جب تک اپنے حبیبﷺ سے ملاقات کا یہ سفر تمام نہ ہوا۔

معجزۂ معراج میں رفتارِ نبوی کا بیان

وقت کی رفتار روک دی گئی، کارخانہ عالم کی ہر شے ساکت کر دی گئی کہ آج میرا محبوبﷺ آسمانوں کی سیر کو آ رہا ہے۔ سفرِ معراج تیز رفتاری میں اپنی مثال آپ ہے کہ ایک قلیل عرصے میں اپنے اختتام سے بھی ہمکنار ہوگیا۔ سدرۃ المنتہیٰ کو عالمِ ملکوت کی آخری سرحد کہا جاتا ہے، ملائکہ کے لئے اس کو عبور کرنا ممکن نہیں۔ سدرۃ المنتہی تک حضورﷺ نے براق پر سفر طے کیا، یہ تیز رفتاری براق کا کمال تھا۔ حضورﷺ کے سفرِ معراج کے ذاتی کمالات کا اظہار تو سدرۃ المنتہی کی حد کو عبور کر جانے کے بعد ہوا جب براق کی برق پائی اور جولائیٔ رفتار جواب دے گئی۔ سدرۃ المنتہی سے ماوراء حضورﷺ کے سفر کی عظمت رفتار سے عالمِ امر کی مخلوق یعنی براق کی تیز رفتاری کو دور کی نسبت بھی نہیں۔ براق کی رفتار حضورﷺ کی رفتار کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اِسی طرح براق کے مقابلے میں انبیاء کرام کے روحانی تصرفات و کمالات کہیں بڑھ کر ہیں اور سرتاجِ انبیاء

علیہ السلام کے کمالات جملہ انبیاء کرام سے بدر جہا زیادہ ہیں۔ بیت المقدس کے سفر میں اثنائے راہ حضور ﷺ کا گذر حضرت موسیٰ کی قبر مبارک کے پاس سے ہوا۔ ارشاد گرامی ہے۔

وھو قائم یصلی فی قبرہ ۔ اور وہ (موسیٰ) اپنی قبر میں نماز ادا کر رہے تھے۔

۱۔الصحیح لمسلم، ۲:۲۶۸، کتاب الفضائل، رقم:۱۶۵

۲۔سنن النسائی، ۳:۲۱۶، رقم:۱۶۳۳۔۱۶۳۷

۳۔مسند احمد بن حنبل، ۵:۵۹

۴۔شرح السنہ، ۱۳:۳۵۱، رقم:۳۷۶۰

۵۔صحیح ابن حبان، ۱:۲۴۲، رقم:۵۰

۶۔مصنف ابن ابی شیبۃ، ۱۴:۳۰۸، رقم:۱۸۳۲۴

عربی لغت کے مطابق یصلی کا لفظ درود وسلام کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

عظمتِ رفتارِ مصطفوی ﷺ

اگر یہاں **یصلی** کے یہ معانی لئے جائیں تو ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضور ﷺ کی گذرگاہ میں سراپا انتظار بنے تھے، جونہی حضور ﷺ تشریف لائے انہوں نے نبی آخرالزماں ﷺ پر درود وسلام سے آپ ﷺ کا استقبال کیا، جب تاجدارِ کائنات ﷺ مسجدُ الحرام سے مسجدِ اقصیٰ پہنچے تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام سمیت تمام انبیاء حضور ﷺ کی پیشوائی کے لئے موجود تھے، جبرئیل علیہ السلام نے اذان دی، حضور رحمتِ عالم ﷺ امامت کے لئے مصلے پر کھڑے ہوئے، آدم علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء نے صفیں درست کیں اور سیاحِ لامکاں

حضرت محمد ﷺ کی اقتدا میں نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل کی۔ ہم بیان کر رہے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سردارِ کائنات جناب رسالتمآب ﷺ کا استقبال کرتے ہوئے حضور ﷺ کی بارگاہ بیکس پناہ میں درودوں کے گجرے اور سلاموں کی ڈالیاں پیش کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ عالمِ بالا میں آیاتِ الٰہیہ کا مشاہدہ کرنے کے بعد نبی ﷺ کا ورودِ مسعود چھٹے آسمان پر ہوا تو بخاری کی حدیث کے اوراَحادیث کی دیگر معتبر کتب کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام حضور ﷺ کی پیشوائی کے لئے بنفس نفیس موجود تھے۔ ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مختلف مقامات پر حضور ﷺ سے پہلے تشریف لے آنا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رفتار اور روحانی تصرفات آقائے دو جہاں ﷺ کی رفتار اور روحانی تصرفات سے زیادہ تھے، مثلاً سفرِ معراج کے پہلے مرحلے میں حضور ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قبر میں نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا لیکن جب حضور ﷺ بیت المقدس تشریف لے گئے تو باقی تمام انبیاء کے ساتھ حضور ﷺ کا استقبال کرنے اور اُن کی اِقتدا میں نماز ادا کرنے والوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی شامل تھے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ حضور ﷺ کا سفرِ معراج براق کے ذریعہ طے پا رہا تھا۔ ایک نبی کی طاقت کا براق کی طاقت سے زیادہ ہونا اک مسلّمہ امر ہے لیکن چونکہ افضلیت کے اِعتبار سے آقائے دو جہاں ﷺ تمام نبیوں اور رسولوں سے اَفضل ہیں اِس لئے عظمتِ رفتارِ مصطفوی تک پہنچنا کسی دوسرے نبی یا رسول کے لئے ممکن نہیں۔ یہاں اِس اَمر کی طرف اِشارہ کرنا ضروری ہے کہ جب سدرۃ المنتہیٰ پر جبرئیل علیہ السلام نے بھی آگے بڑھنے سے معذوری کا اِظہار کر دیا اور براق کی تیز رفتاری بھی ختم ہوگئی اور اُس کے بعد براق کے لئے ایک قدم اٹھانا بھی ممکن نہ رہا تو لامکاں کی بے کراں وسعتوں میں آگے کا سفر تاجدارِ کائنات ﷺ کے اپنے روحانی کمالات کا مرہونِ منت تھا جن کا

اندازہ اور تصور بھی ذہنِ انسانی کے لئے ممکن نہیں۔

سفرِ معراج کی جزئیات کا اِحاطہ ممکن نہیں

کائنات میں عجائبات کی ایک دنیا آباد ہے اس طرح سفرِ معراج میں بھی حضور رحمتِ عالم ﷺ نے اَن گنت عجائبات کا مشاہدہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سفرِ معراج کی جملہ تفصیلات اور ان مشاہدات کی جزئیات کا احاطہ ممکن ہی نہیں۔ شبِ معراج کی تفصیلات تک رسائی حدیث کی ہزاروں کتابوں کے عمیق مطالعے کے بغیر نہیں ہوسکتی اور پھر اِن تفصیلات اور جزئیات کو حیطۂ اِدراک میں لانا عقلِ اِنسانی کے بس کی بات نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حدیث کی چند کتابوں کا سرسری سا مطالعہ کر کے ہم نے جملہ تفصیلات سے آگاہی حاصل کر لی ہے چنانچہ اکثر لوگ اپنے محدود مطالعہ کی بناء پر کہہ دیتے ہیں کہ سدرۃ المنتہیٰ تک حضور ﷺ کے سفرِ معراج کا ذکر ملتا ہے، اِس سے آگے جو کچھ ہے وہ تخّیل کی بلند پروازی کا کرشمہ ہے یا صرف شاعرانہ باتیں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں حالانکہ اَمر یہ ہے کہ کسی شخص کے لئے اِن ہزاروں کتابوں میں بکھری ہوئی تفصیلات کا مکمل شعور ممکن ہی نہیں۔ سدرۃ المنتہیٰ سے آگے کے سفر کو شاعری سمجھ لینا کورفہمی نہیں تو اور کیا ہے۔

اِس ضمن میں اِمام زرقانیؒ رقمطراز ہیں:

جاوز السبع الطباق و ھی السمٰوت۔	آپ ساتویں آسمان سے آگے نکل گئے۔

سفرِ معراج جو کائنات کا سب سے عظیم سفر ہے اور دیگر معجزات کی طرح اللہ رب العزت کی قدرت کا مظہر ہے سات طبقات، آسمانوں اور اُن سے وراء الوراء سدرۃ المنتہیٰ اور قابَ قوسین اور پھر کرۂ ارضی کی طرف واپسی پر مشتمل ہے۔ اِس کی

توجیہہ وتوضیح عقلِ انسانی کے بس کی بات ہی نہیں۔ اِذَا ھَوٰی میں عظیم رفتار کی قسم زمانی اور مکانی فاصلوں کے ایک پل میں طے ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ فاصلے سمٹ رہے ہیں اور کروڑوں اَربوں سالوں کی مسافت لمحوں میں مکمل ہو رہی ہے۔ یہاں عقلِ ناقص اپنے عجز کا اِظہار کرنے کے سوا کیا کرسکتی ہے۔ سفرِ معراج اتنی بڑی کائناتی سچائی ہے کہ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کا سارا اِرتقاء اِس سفر کے خوشہ چینی کے سوا کچھ نہیں، جوں جوں انسان اپنے علم اور تجربات کی روشنی میں سفرِ معراج کے مختلف مراحل کی پرتیں کھولتا جائے گا اَن گنت کائناتی سچائیوں کا اِنکشاف ہوتا جائیگا اور جدید علوم کا دامن حیرت انگیز معلومات سے بھرتا جائیگا۔ سفرِ معراج کی جزئیات سے آگاہی علومِ جدیدہ کے ارتقاء کی ضامن ہے۔ معجزۂ معراج تو حضور ﷺ کی حیاتِ مقدّسہ کا ایک پہلو ہے۔ اگر حضور ﷺ کی ذاتِ اَقدس سے اِکتسابِ شعور کرکے اِنسانی اِرتقائی بلندیوں پر گامزن رہا تو خدا جانے آنیوالے زمانوں میں یہ اِرتقاء کِن بلندیوں پر فائز ہوگا۔ یہ تمام بلندیاں بھی صاحبِ معراج کی گرد پا ہوں گی اِس لئے جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہر صدی حضور ﷺ کی صدی ہے، ہر زمانہ حضور ﷺ کا زمانہ ہے تو یہ کوئی جذباتی بات نہیں ہوتی بلکہ اِن کی بنیاد حضور ﷺ کی نقوشِ کفِ پا سے پھوٹنے والی اِن عظیم روشنیوں کے اِبلاغ پر اُٹھائی جاتی ہے جو تہذیبِ انسانی کے اِرتقاء کے ہر مرحلے پر اِہتمامِ چراغاں کر رہی ہیں۔

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى کا پانچواں معنی:-

’’قلبِ انور کا اَنوار وتجلّیاتِ اِلٰہیہ کا مرکز بننا‘‘

اگر **النجم** سے حضور ﷺ کا قلبِ منور مراد لیں تو اِس اَمر کی مناسبت سے ھویٰ کا ایک معنی اِنْشَرَحَ مِنَ الْاَنْوَار یعنی انوار وتجلیات سے کھل جانا ہوگا او

رآیتِ مقدّسہ کا مفہوم کچھ یوں ہوگا ''قسم ہے ستارے کی طرح چمکتے ہوئے محبوب ﷺ تیرے قلبِ منور کی''، اِذَا هَوٰی جب اَنوار وتجلیاتِ اِلٰہیہ سے اِس کا اِنشراح ہوا یعنی وہ کھل گیا۔

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰی کا چھٹا معنی:

''کائنات کی ہر چیز پر رحمتِ محمدی ﷺ محیط ہے''

حضور سرورِ کائنات ﷺ کو کل جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا، اِس کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز پر رحمتِ محمدی ﷺ محیط ہے۔ نجم کا ایک اور معنی بھی ہے گھاس '' النبت''، وہ گھاس جو قلیل مقدار میں لگائی جائے لیکن اتنی پھیل جائے کہ ساری کی ساری کیاری کو اپنے دامن میں سمیٹ لے، حضور ﷺ کی رحمت نے بھی کائنات کی ہر شے کو اپنے دامن رحمت کے سائے میں لے رکھا ہے۔ سورہ الرحمٰن میں بھی **نجم** کا لفظ گھاس کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ o نباتات اور درخت (بھی سب اس کے) حکم کے تابع ہیں o (الرحمٰن، ٥٥:٦)

یہاں بتایا جارہا ہے کہ نباتات اور درخت رب کائنات کے حکم کے پابند ہیں بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ اسکے تابع ہے کیونکہ وہ ہر جاندار اور غیر جاندار کا رب ہے اور کوئی اس کی خدائی میں اس کا شریک نہیں وہ ازل بھی ہے اور ابد بھی نہ اس کی کوئی ابتداء ہے اور نہ انتہاء۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گھاس سے کیا مراد ہے اور درخت کسے کہتے ہیں۔ گھاس سے مراد وہ پودے ہیں جن کے تنے نہیں ہوتے، وہ براہ راست زمین سے اپنا رزق لیتے ہیں اور درخت سے مراد وہ پودے ہیں جن کے تنے ہوتے ہیں اور

وہ اوپر کی طرف بڑھتے ہیں، گھاس کی طرح زمین پر پھیلتے نہیں اور پتے اور شاخیں ان تنوں کے ذریعے زمین سے توانائی حاصل کر کے نشو ونما پاتے ہیں۔

آیتِ مقدسہ میں **نجم** کا لفظ اِستعارۃً بیان کیا گیا ہے۔ ہادیٔ کون و مکاں ﷺ کو **نجم** سے تشبیہہ دی گئی ہے کہ جس طرح گھاس پوری کیاری کو اپنے آنچل میں چھپا لیتی ہے اور ہر طرف گھاس ہی گھاس نظر آتی ہے اور زمین اس گھاس کے سائے میں چھپ جاتی ہے یعنی گھاس پھیل کر زمین کے اس ٹکڑے پر محیط ہو جاتی ہے، اے کالی کملی اوڑھ کر سونے والے محبوب! ﷺ تیری رحمت اور تیرے نور کا دائرہ گھاس کی طرح ہر چیز کو اپنے دامنِ رحمت میں لے لیتا ہے کہ ہر سو تو ہی تو نظر آتا ہے ہر طرف تیری رحمت کے پرچم لہرا رہے ہیں ہر طرف تیرے محاسن اور محامد کی قندیلیں روشن ہیں۔ محبوب! ﷺ تیرے رخِ زیبا کی قسم، میں جس جس عالم کا رب ہوں اُس اُس عالم کے لئے تو رحمت ہے۔ یہ ساری کائنات رنگ و بو، یہ خلا کی بے اَنت وسعتیں، یہ سورج، چاند ستارے، دھنک کے بکھرتے ہوئے رنگ، پھولوں کی مہکاریں، پرندوں کی چہکاریں، کہکشاؤں کی پھیلتی ہوئی دنیائیں۔ محبوب! ﷺ یہ سب کچھ تیری مملکتِ کرم کا حصہ ہے۔ یہ سب کچھ تیرے حیطۂ رحمت میں ہے حتیٰ کہ سدرۃ المنتہیٰ اور عرشِ بریں بھی تیرے نقوشِ کفِ پا کی قدم بوسی سے مشرف ہوئے اِس لئے کہ سدرۃ المنتہیٰ اور عرشِ بریں بھی میری تخلیق ہے اور میری مخلوقات میں تو سب سے اول ہے۔

پیارے! تو میرا شاہکارِ تخلیق ہے، نہ تیری کوئی نظیر ہے اور نہ کوئی تیری مثال، میں خالق ہونے میں یکتا و تنہا تو مخلوق ہونے میں یکتا و تنہا، عبدیت تیرا جمال، بندگی تیرا حسن اور عجز تیرا وقار ہے۔ محبوب! ﷺ تیرا نورِ رحمت کائنات کی ہر شے پر محیط ہے۔ شبِ معراج ہم نے تجھے آسمانوں کی سیر اس لئے کرائی کہ تو دیکھ لے کہ تیری اَقلیمِ رحمت کی سرحدیں کہاں تک ہیں۔ محبوب! ﷺ اِس لئے تجھے رحمۃ للعالمین بنایا، تو تمام

جہانوں کے لئے رحمت ہے، تمام جہان تیری رحمت کے محیط میں مانندِ حباب ہیں، ہر طرف تیرا ہی نور جلوہ فرما ہے، ہر طرف تیرے جمال کی رعنائیاں بکھری ہوئی ہیں، محبوب! ﷺ ہر طرف تیری ہی روشنی ہے۔

اِقبالؒ نے اِسی طرف اِشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

گنبدِ آبگینہ رنگ ترے محیط میں حباب

لفظ ھوٰی کے مختلف معانی:

ھوٰی کا پہلا معنی ''فنا ہونا''

عربی لغت کے مطابق ھویٰ کا ایک معنی ہلاک ہونا، فنا ہونا بھی آتا ہے۔ اِس معنی کے مطابق آیتِ مقدسہ کا مفہوم کچھ یوں ہو گا کہ قسم ہے اے محبوب! ﷺ تیرے پاک وجود کی، تیری ذاتِ اَقدس کی کہ وہ اللہ کی ذات میں فنا ہوکر بقائے دوام کے مقام پر فائز ہو گئی، اِسی طرح محبوب! ﷺ تیری صفات بھی اللہ رب العزت کی صفات میں فنا ہوکر بقا پا گئیں۔ اے محبوب! ﷺ تو ہمارے قرب کے اِس درجے تک پہنچا کہ تیری ذات کو بھی فناءِ تام نصیب ہوا اور تیری صفات کو بھی۔

قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی o فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی o (النجم، ۵۳:۹-۱۰)	پھر (اس محبوبِ حقیقی سے) آپ قریب ہوئے اور آگے بڑھے پھر (یہاں تک بڑھے کہ) صرف دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا o

اہلِ علم نے آیتِ مذکورہ کی متعدد تعبیرات بیان کی ہیں، اِن میں سے ایک تعبیر یہ بھی ہے کہ دَنٰی اور تَدَلّٰی دو الگ الگ لفظ ہیں، یہ دونوں الفاظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے قریب ہونے یا کسی چیز کے قرب پر دلالت کرتے ہیں۔ عربی گرائمر کی رُو سے کلمہ دَنٰی فعل ہے، اِس کا فاعل ضمیرِ مُستتر (ھُوَ) ہے، اِسے خواہ اللہ کی طرف لوٹا

دیں یا حضور ﷺ کی طرف، اس کا معنیٰ ہوگا جب حضور ﷺ کی صفات اللہ رب العزت کی صفات کے قریب ہوئیں اور اِتنا قریب ہوئیں جتنا ممکن تھا یعنیقرب اپنی اِنتہاء کو پہنچ گیا اور حضور ﷺ کی صفات کو فناءِ تام نصیب ہو گیا۔ **فَتَدَلّٰی** پھر حضور ﷺ کی ذات اللہ تعالیٰ کی ذات کے قریب ہوئی تو ذاتِ حضور ﷺ کو بھی فناءِ تام نصیب ہوا۔

دوسرا معنی:- ''مانندِ برزخ ہونا''

والنجم سے اگر مراد حضور ﷺ کی ذاتِ اَقدس اور حضور ﷺ کا سراپا ہی مراد ہو تو پھر هَوٰی کا ایک معنیٰ مانندِ برزخ بھی ہے۔ **الشیئ القائم بین الحلق والصدر**، وہ چیز جو حلق اور سینے کے درمیان اٹکی ہوئی ہو، اِس اِعتبار سے آیت مقدّسہ (**والنجم اذا ھوی**) کا مفہوم یہ ہوگا کہ قسم ہے چمکتے ہوئے ستارے محمد! ﷺ تیرے وجود اور تیرے سراپا کی، جب تو شبِ معراج اِتنا اُونچا ہو گیا کہ خلق نیچے رہ گئی اور صرف خالق تری ذات کے اُوپر تھا۔ اے محبوب! ﷺ تو نے خالق اور اُس کی تمام مخلوقات کے درمیان درجہ پایا یعنی

بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر

تیرا سراپا خالق سے نیچے اور مخلوق سے اُوپر تھا۔ یہ حضور ﷺ کی شانِ برزخی ہے۔

اُدھر اللہ سے واصل اِدھر مخلوق میں شامل
خواص اُس برزخِ کُبریٰ کو ہے حرف مشدّد کا

جس حرف کے اوپر شدّ ہو اسے حرفِ مشدّد کہتے ہیں۔ شد حرف کو واضح کرتی

ہے اس کی تین حیثیتیں ہوتی ہیں، ایک حیثیت اِس کے اپنے سراپا کی یعنی جس سے وہ خود قائم ہے اور دو حیثیتیں اِس کی اور ہوتی ہیں مثلاً ایک لفظ ہے ''معلّم'' اِس میں لام حرف مشدّ د ہے لام کی تین حیثیتیں ہیں۔

۱- پہلی اس کی حرف **لام** کے طور پر اپنی حیثیت

۲- دوسری یہ کہ **لام** اپنے سے پہلے حرف یعنی ع کے ساتھ ملا ہوا ہے،

۳- تیری حیثیت اپنے سے اگلے حرف **م** سے ملا ہونا ہے

درمیان میں ل کا اپنا سراپا ہے ایک ہاتھ اس کا ع پر ہے اور ایک م پر، اگر ل درمیان میں ہوتو اِس کی وساطت سے پچھلا میم اگلے ع سے مل سکتا ہے لیکن اگر ل کا واسطہ درمیان سے نکال دیں اور چاہیں کہ م کا ع سے اِتصال ہو جائے تو یہ ناممکن ہے۔ اگر م عین سے ملنا چاہے تو اسے ل کا دامن پکڑ نا پڑے گا، اسے کہتے ہیں حرف مشدّ د۔ خدا نے فرمایا محبوب! ﷺ تیری ذات حرفِ مشدّ د کی طرح برزخی شان کی حامل ہے، میرے اور بندے کے درمیان ایک واسطہ تو ہے اب جو مجھ تک رسائی حاصل کرنا چاہے گا محبوب! ﷺ اِسے تیری دہلیز پر ہو کر آنا پڑے گا کیونکہ تیرے واسطے کے بغیر مجھے اپنی توحید بھی قبول نہیں۔ اِس توحید کو سندِ اِعتبار عطا کروں گا جس کا اظہار تیری ذات کے حوالے سے ہوگا۔ محبوب! ﷺ اِس لئے میں نے کہیں بھی تجھے اپنے سے جدا نہیں کیا۔ اَذانوں میں میرے نام کے ساتھ محبوب! ﷺ تیرا نام بھی گونجتا ہے۔ اُس وقت تک میں کسی کی عبادت ہی قبول نہیں کرتا جب تک وہ نماز میں تجھ پر درود وسلام نہ بھیجے، محبوب! ﷺ میں اور میرے فرشتے تجھ پر درود بھیجتے رہتے ہیں اور اِیمان والوں کو بھی حکم ہے کہ تجھ پر درود اور سلام بھیجا کریں۔ محبوب! ﷺ تیری محبت ہی میرے مومنین کا معیارِ اِیمان ہے۔ محبوب! ﷺ اگر تجھے پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو یہ کائنات کبھی

بھی معرض وجود میں نہ آتی، یہ سب رعنائیاں تیرے ہی قدموں کا تصدق ہیں۔ یہ سب بہاریں تیری ذات اَطہر کی خیرات ہیں۔

رسولِ کائنات ﷺ کی تین حیثیتیں

رسول کائنات حضور رحمت عالم ﷺ کی تین حیثیتیں ہیں۔

(i) ایک حیثیت حضور ﷺ کے اپنے سراپے کی ہے۔

(ii) دوسری حیثیت سے حضور ﷺ اللہ جل شانہٗ سے واصل ہیں۔

(iii) تیری حیثیت سے حضور ﷺ مخلوق میں شامل ہیں۔

رسولِ کون و مکاں ﷺ کا اپنا سراپا درمیان میں ہے۔ اُدھر اللہ سے واصل اور اِدھر مخلوق میں شامل، حضور ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ اللہ دیتا ہے، عطا کرتا ہے کہ وہ اپنی تمام مخلوقات کا رب ہے، میں تقسیم کرنے والا ہوں اللہ کی نعمتیں بانٹنے والا ہوں یعنی خالق اور مخلوق کے درمیان حضور ﷺ کا واسطہ لازمی اور ضروری ہے۔ آقائے کائنات ﷺ کا ایک ہاتھ دہلیز الوہیت پر ہے اور دوسرا مخلوقِ خدا کے برہنہ سروں پر، ایک ہاتھ سے اللہ رب العزت سے فیض لے رہے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے وہی فیض مخلوقِ خدا میں تقسیم فرما رہے ہیں۔ درمیان میں سراپائے محمد ﷺ ہے تو اس وساطت سے مخلوق اپنے خالق سے مل رہی ہے۔

تیسرا معنیٰ :- ''پھوٹنا، جاری ہونا''

لفظ هَوَىٰ پھوٹنے اور جاری ہونے کے معنوں میں بھی اِستعمال ہوتا ہے تو اِس اِعتبار سے آیتِ مقدّسہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ قسم ہے قلبِ محمد ﷺ کی کہ جب اِس سے اَنوارِ الٰہی کے چشمے پھوٹنے لگے، اِس نے انوارِ الٰہی کو اپنے اندر اتنا جذب کرلیا۔ اَنوار

اِلٰہیہ کا اِنشراح و اِنفجار ہوا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرْضِ ط مَثَلُ نُوْرِہٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ط اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ط اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ......
(النور، ۲۴:۳۵)

اللہ (ہی) آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اُس کے نور کی مثال (جو نورِ محمدی کی شکل میں دنیا میں روشن ہوا) اُس طاق (نما سینۂ اقدس) جیسی ہے جس میں چراغ (نبوت روشن) ہے۔ (وہ) چراغ فانوس (قلبِ محمدی) میں رکھا ہے۔ (یہ) فانوس (نورِ الٰہی کے پَرتو سے اِس قدر منور ہے) گویا ایک درخشندہ ستارہ ہے۔

حضور ختمی مرتبت ﷺ کے قلبِ اطہر کا یہ عالم ہے کہ سینۂ اقدس کے شیشے سے اَنوارِ الٰہیہ کا اِنشراح ہو رہا ہے اور کرنیں پھوٹ پھوٹ کر باہر آ رہی ہیں۔

چوتھا معنی:۔ ’’غیر اللہ سے منقطع ہونا‘‘

عربی لغت میں ھویٰ کا غیر اللہ سے منقطع ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اِس اِعتبار سے آیت مقدسہ سے مفہوم یہ ہوا ’’قسم ہے قلبِ محمد ﷺ کے اُس حال کی کہ جب وہ اللہ کے سوا ہر ایک سے منقطع ہو گیا، دنیا کی ہر چیز سے مستغنی اور بے نیاز ہو گیا، اللہ تعالیٰ کی یاد، مشاہدے اور وصال میں سب کچھ بھول گیا۔

مَاضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى o
(النجم، ۵۳:۲)

تمہارے آقا اپنے مقصد سے اِدھر اُدھر ہوئے نہ بھٹکے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰی ٥ (النجم،۵۳:۴-۳)

نہ نگاہ جھپکی نہ حد سے بڑھی (جس کو دیکھنا تھا اس پر جمی رہی، نہ پلک جھپکتی نہ ادھر ادھر ہوتی، انوارِ ذات کی کیفیات نگاہیں براہ راست دیکھ رہی تھیں)٥

پانچواں معنی:- ''محبت وخواہش''

عربی لغت میں ھوٰی کا ایک معنی محبت اور خواہش کا بھی ہے یعنی اَلْحُبُّ وَالْاِشْتِهَاءُ

(الشفاء،۱:۴۶)

مثلاً قرآن مجید میں اس کا حقیقی معنی یہی ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰی ٥ (النجم،۵۳:۱۷)

اور وہ اپنی (یعنی نفس کی) خواہش سے بات ہی نہیں کرتے ٥

محمد ﷺ اپنی خواہش اور اپنی مرضی سے کچھ ارشاد نہیں فرماتے بلکہ آپ ﷺ وہی کچھ ارشاد فرماتے ہیں جو انہیں اپنے رب کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے۔

وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی ٥ (النازعات،۷۹:۴۰)

اور جس نے اپنے نفس کو (ہر بری) خواہش سے روکا ہوگا٥

قرآن مجید کی آیات مقدسہ کی روشنی میں ھوی کا معنی ہوا کسی خواہش کا پیدا ہونا، اس کا بھڑک اٹھنا، خواہش میں شدت پیدا ہونا، محبت، میلان اور رجحان کا اپنی انتہا کو پہنچ جانا، جذبے کی شدت کا اظہار مقصود ہوتو لفظ ھوی استعمال کیا جاتا ہے۔

ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى میں تو ھوی کی نفی کی جا رہی ہے۔ھوی کا اثبات حضور ﷺ کے لئے کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح نفس کے درجات ہوتے ہیں اسی طرح ھوی کے بھی درجات ہوتے ہیں۔

درجاتِ نفس

نفس کے مندرجہ ذیل درجات ہوتے ہیں۔

۱۔نفس امارہ	۲۔نفس لوامہ
۳۔نفس ملھمہ	۴۔نفس مطمئنہ
۵۔نفس راضیہ	۶۔نفس مرضیہ
۷۔نفس کاملہ	۸۔نفس صافیہ

اس آیتِ مقدسہ میں جس نفی کا ذکر کیا گیا ہے وہ نفسِ اَمّارہ کی ہے کیونکہ اس کی ھَوٰی مذموم ہوتی ہے۔ چونکہ ھَوٰی کا معنی میلان، رجحان اور رجوع اور رغبت ہے تو نفس جب تک اَمّارہ ہو اُس کا رجحان اور میلان اور رجوع حب الشھوات اور مذموم خواہشات کی طرف ہوگا۔ گویا لذتِ گناہ اِس کے لئے زیادہ پرکشش ہوگی لیکن جب ھَوٰی کی نسبت تاجدارِ کائنات ﷺ کی طرف اور خدا کے مقرب بندوں کی طرف ہوتو اُس سے ھوائے مذموم کی نفی ہو جائے گی کیونکہ اَمّارہ ہوگا تو ھوائے مذموم ہوگی اور جب نفسِ مطمئنہ، راضیہ اور مَرضیہ کے رجوع اور میلان و رجحان میں بھی اِشتہاء ہوتی ہے۔ جس طرح نفسِ اَمّارہ کے اندر خواہش کی آگ بھڑکتی ہے اِسی طرح نفسِ مطمئنہ، راضیہ اور مَرضیہ کی حالت میں بھی خواہش کی آگ بھڑک اٹھتی ہے لیکن اَمّارہ کا رجوع مذموم ہوتا ہے جبکہ نفسِ مطمئنہ کا رجوع قرآن

اِن اَلفاظ میں بیان کرتا ہے:

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ o	اے اطمینان پا جانے والے نفس! o تو
ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً	اپنے رب کی طرف اس حال میں لوٹ
مَّرْضِیَّةً o	آ کہ تو اس کی رضا کا طالب بھی ہو اور
(الفجر، ۸۹:۲۷-۲۸)	اس کی رضا کا مطلوب بھی o

یہ نہیں کہ نفس مطمئنہ کا رجوع اور میلان نہیں، نفس مطمئنہ کا بھی رجوع اور میلان ہے مگر رجوع مذموم کی بجائے یہ رجوع اور میلان اپنے رب کی طرف ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر جب نفس نفس مطمئنہ کے درجے تک چلا جاتا ہے تو اس کا میلان خالقِ کائنات کی طرف ہو جاتا ہے۔ اس کا منفی پہلو ختم ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے جب نفس کا رجحان یا میلان اپنے رب کی طرف ہوگا تو مثبت ھوی ہے منفی ھوی نہیں۔ اب اس آیت مقدسہ کا مفہوم کچھ یوں ہوگا ''قسم ہے محبوب تیرے پاک دل کی اس حالت کی جب اس میں میرے عشق و محبت اور میری ملاقات کی خواہش اور آرزومندی کی آگ بھڑک اٹھی، جب اِس کے اندر لقائے الٰہی اور دیدارِ الٰہی اور وصال الٰہی کے شوق کی اور عشقِ الٰہی کی آگ مشتعل ہوگئی۔

اس کی تائید بھی قرآن کریم فراہم کرتا ہے:

وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی o	اور اس نے آپ کو اپنی محبت میں خود
(الضحیٰ، ۹۳:۷)	رفتہ و گم پایا تو اس نے مقصود تک پہنچا
	دیا o

جب عشق کی آگ من میں بھڑک اٹھتی ہے، نفس کا رجحان و میلان اپنے رب کی طرف ہو جاتا ہے تو وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ فضائے اعتکاف اس کی روح پر بھی محیط ہو جاتی ہے۔ غاروں میں چالیس چالیس دن تک بن کھائے پیئے مراقبے

ہونے لگے، دنیا کی رونقوں سے دل اچاٹ ہوا اور غار حرا کی خلوتوں میں جلوتوں کے چراغ جلنے لگے، غارِ حرا کے سناٹے ذکر الٰہی سے گونج اٹھے، تاریکیوں میں عشق کی چاندنی بکھرتی چلی گئی، ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ فرماتی ہیں کہ جوں جوں بعثت کا وقت قریب آتا گیا توں توں حضور ﷺ خلوت پسند ہوتے گئے۔ آپ ﷺ ایک ہفتے یا دو ہفتوں کا کھانا لے کر گھر سے دور پہاڑوں میں چلے جاتے اور مہینہ مہینہ چالیس چالیس دن وہاں قیام فرماتے اور گھر تشریف نہ لاتے۔ آپؓ فرماتی ہیں کہ میں پریشان ہوکر حضور ﷺ کی تلاش میں گھر سے نکل پڑتی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب غار حرا میں آپ کے پاس پہنچتی تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی کہ جو کھانا حضور ﷺ گھر سے لائے تھے وہ اسی طرح ایک طرف پڑا ہے اور آپ ﷺ مراقبے کی حالت میں تشریف فرما ہیں۔

فرمایا رب کائنات نے کہ اے محبوب! ﷺ جب ہم نے دیکھا کہ تیرے قلب اطہر کے اندر ہمارے عشق و وصال کی آگ اتنی بھڑک اٹھی ہے کہ تجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا حتی کہ تو اپنے آپ کو بھی بھول گیا تو ہم نے تجھے اپنے حسن مطلق کے بے نقاب جلوے کرائے۔ پھر فرمایا اذا ھوی قسم ہے محبوب تیرے دل کی اس حالت کی کہ جب اس میں میری ملاقات اور دیدار کی خواہش و آرزومندی کی تڑپ شعلہ جوالہ بن گئی۔ جب ہم نے تمہارے دل کی اس حالت کو دیکھا تو تجھ پر انعامات و اکرامات کی بارشیں کر دیں اور تجھے سفر معراج کی عظمتوں اور رفعتوں سے ہمکنار کیا۔

آگ اتنی بھڑک اٹھی کہ حالت ''ضال''کو جا پہنچی۔ سب کچھ بھول گیا۔ غاروں میں چالیس چالیس دن تک بن کھائے پیئے مراقبہ ہونے لگے، دنیا کی رونقوں سے دل اچاٹ ہوگیا اور تحنث کی حالت کو جا پہنچے۔

ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ فرماتی ہیں کہ جوں جوں بعثت کا وقت

قریب آ تا گیا توں توں حضور ﷺ خلوت پسند ہوتے گئے۔ آپ ﷺ ہفتہ، دو ہفتے کا کھانا وغیرہ لے کر گھر سے دور پہاڑوں میں چلے جاتے اور مہینہ مہینہ، چالس چالیس دن واپس نہ آتے۔ میں پریشان ہو کر آپ ﷺ کو ڈھونڈنے نکل پڑتی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب غار حرام میں آپ کے پاس پہنچتی تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی کہ جو کھانا حضور ﷺ لائے تھے وہ اسی طرح ایک طرف پڑا ہے اور مراقبے کی حالت میں آپ ﷺ تشریف فرما ہیں۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰیO	اور اس نے آپ کو اپنی محبت میں خود
(الضحیٰ، ۹۳:۷)	رفتہ وگم پایا تو اس نے مقصود تک پہنچا دیا

اے محبوب! ﷺ جب ہم نے دیکھا کہ تیرے قلب مبارک کے اندر عشق و وصال کی آگ اتنی بھڑک اٹھی ہے کہ کچھ بھی یاد نہیں رہا حتی کہ اپنا آپ بھی بھول گیا تو **فهدٰی** ہم نے تجھے اپنے حسن مطلق کے بے نقاب جلوے کرائے۔

دوسری طرف فرمایا۔

اِذَا هَوٰی قسم ہے محبوب! تیرے دل کی اس حالت کی کہ جب اس میں میری ملاقات اور دیدار کی خواہش و آرزومندی کی تڑپ شعلہ جوالہ بن گئی۔ جب ہم نے آپ کے دل کی اس حالت کو دیکھا تو **ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی** کی نوازشیں کیں۔

اِنتہائے قربِ الٰہی کی ایمان اَفروز تفسیر

شفق رنگ لمحوں کو تخلیقی سطح پر گرفت میں لیا جائے تو عجب سی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ مشاہدہ قدرت میں قدم قدم پر یہی احساس کارفرما نظر آتا ہے مثلاً جب آفتاب جہاں تاب مطلع آسمان پر نمودار ہوتا ہے تو صبح کی آمد کا اعلان ہوتا ہے۔

جب سوا نیزہ پر بلند ہوتا ہے تو اس کے روپ کو اشراق کا نام دیتے ہیں۔ کچھ اور بلند ہوتا ہے تو اس حالت کو چاشت کہا جاتا ہے۔ طلوع کے یہ مختلف روپ اور انداز مہر عالم تاب کی ضوفشانیوں کے مختلف مظاہر ہیں۔ جس طرح آفتاب دنیا کا طلوع تین مختلف مطالع پر جلوہ سامانیوں کے نئے انداز کے ساتھ سامنے آتا ہے اسی طرح آفتاب رسالت کی ضیا پاشیاں بھی تین مختلف مطالع پر جلوہ گر ہوئیں۔ اَنوارِ محمدی ﷺ کائنات کی ہر شئے پر محیط ہیں۔ یہی انوار فرد کے باطن اور ظاہر کا منظر نامہ بھی دھنک کے سات رنگوں سے تحریر کرتے ہیں۔ یہی انوار فضائے بسیط میں پرفشاں نظر آتے ہیں۔ دہلیز مصطفیٰ ﷺ پر نور کا باڑا بٹتا ہے۔ فاران کی چوٹیوں پر چمکنے والے آفتاب رسالت کی ضیا پاشیاں کائنات کے ہر افق کو منور و تاباں رکھتی ہیں کیونکہ انوار محمدی اور رحمت محمدی ﷺ کو کسی پیمانے میں محدود نہیں کیا گیا بلکہ خلا کی بے انتہا وسعتوں میں دامانِ رحمت کی اِسی اُترن کا فیضان دکھائی دیتا ہے۔

کفر و شرک کے گھپ اندھیروں میں آفتاب رسالت کی پہلی کرن نمودار ہوئی تو ردائے شب کے چاک ہونے کا منظر دیدنی تھا۔ کرۂ ارضی پر بسنے والی اولادِ آدم کو گناہ اور گمراہی کی طویل شب کے خاتمے کا یقین ہی نہیں آتا تھا لیکن روشنی ان کے دروازوں پر دستک دے رہی تھی۔

آفتابِ رسالت کا تین مطالع پر طلوع

پہلا طلوع

آپ ﷺ کا جلوہ اولین مطلع عالم بشریت پر ہوا تو چہرہ بشریت اس کی ضو سے تابناک ہو گیا۔ تاریکیوں کے بادل چھٹ گئے اور شبستان ہستی کا گوشہ گوشہ انوار و تجلیات سے چمک گیا۔ بیت المقدس میں دیباچہ وخلاصہ کائنات جناب سرور انبیا ﷺ

کے مقتدی ہوئے اور عالم بشریت کے مطلع پر وہ سحر طلوع ہوئی جس نے صدیوں کی تاریک رات کو سرمدی اجالوں میں بدل دیا۔ ظلمت شب اپنا رخت سفر باندھ کر رخصت ہوئی۔

دوسرا طلوع

سفرِ معراج نے نہ صرف حضور ﷺ کی بشریت اور نورانیت کو نئے مفاہیم عطا کئے بلکہ سرِ عرش مہمان عرش کی پذیرائی اور پیشوائی نے ان گنت اشکالات کو رفع کر کے حقائقِ مصطفوی پر سے پردہ اٹھایا اور عقلِ ناقص کے پاس اپنے عجز کی چادر کو سمیٹنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

دوسرا طلوع جس پر آپ ﷺ کے کمالات کا ظہور ہوا وہ عالمِ ملکوت و نورانیت تھا۔ جہاں تمام قدسیانِ فلک اور ملائکہ حضور ﷺ کی آمد کی خبر سن کر چشم براہ تھے تاکہ جلوہ دیدار مصطفوی ﷺ سے وہ بھی فیض یاب ہو سکیں۔ نہ جانے وہ کب سے اس ساعت سعید کے منتظرِ بارگاہِ صمدیت میں عرض پرداز تھے کہ اے باری تعالیٰ! ہمیں اپنے حبیب ﷺ کی زیارت سے بہرہ ورفرما۔ احادیث میں ہے کہ بیک وقت ستر ہزار فرشتوں کو حضور ﷺ کے روضۂ اقدس پر حاضری کی سعادت صرف ایک بار نصیب ہوتی ہے اور دوسری بار یہ موقعہ تا قیام قیامت میسر نہیں آتا۔

بارگاہِ صمدیت میں فرشتوں کی عرضداشت قبول ہوئی اور معراج کی ساعت مسعود آئی۔ انہیں سدرۃ المنتہٰی پر اکٹھے ہونے کا حکم دیا گیا تاکہ حبیب ﷺ ادھر سے گزریں اور یہاں کچھ دیر توقف فرمائیں تو وہ ان کے حسن و جمال کے دیدار سے فیض یاب ہو جائیں۔ حور و غلمان کے پرے کے پرے رہگزرِ مصطفیٰ ﷺ پر اپنی پلکوں کا ریشم بچھا رہے تھے۔ ملائکہ، ہجوم در ہجوم نبی آخر الزماں ﷺ کے منتظر تھے۔ آج سدرۃ المنتہی

کوحضورﷺ کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہو رہا تھا۔ سدرۃ المنتہی سے آگے جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔ انوارِ رحمت حضورﷺ کی پیشوائی کے لئے پُر فشاں تھے۔

چنانچہ مشیّتِ ایزدی سے تمام فرشتے جمالِ مصطفویﷺ سے سرشار ہونے کے لئے سدرۃ المنتہی کے مقام پر سمٹ کر ہمہ تن دید ہو گئے اور حضورﷺ جب تشریف لائے تو ''آمد آمد یارے کہ ما مے خواستیم'' کا غلغلہ بلند ہوا۔ قرآن اس منظر کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی o (النجم، ۱۶:۵۳)	جب سدرہ کو ڈھانپ لیا جس چیز نے ڈھانپ لیاo

حضور نبی اکرمﷺ نے اس کی وضاحت میں ارشاد فرمایا کہ نخل سدرہ کے ہر ہر پتے پر ایک ایک فرشتہ بیٹھا ہوا تھا۔ سارے آسمانوں کے فرشتوں کے لئے سدرۃ المنتہی گویا ایک بیٹھک کی طرح تھا جہاں کروبیانِ افلاک آپ کے جلووں سے مستفیض ہونے کے لئے اُمڈ آئے تھے۔

جمالِ مصطفویﷺ سے تمام ملکوت فروغ گیر ہوا اور اس کے انوار و تجلیات دوسرے مطلع پر ہر سمت پھیل گئے۔ اس طرح حضورﷺ کے معراج کے اس پہلو سے عالم ملکوت کا ہر فرد مستفیض ہوا اس لئے کہ انوارِ محمدیﷺ نورانی مخلوقات کے سر کا بھی سائبان ہیں۔

تیسرا طلوع

نجم مصطفویﷺ کا تیسرے مطلع پر طلوع ہونے کا ہنگام آ پہنچا تو آپﷺ تن تنہا سدرۃ المنتہٰی سے آگے عالم لامکاں کی سمت بڑھے اور مقام قاب قوسین پر آپ

ﷺ کوقرب وحضور کا جواعزاز نصیب ہوا اسے قرآن پاک نے

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ o — بے شک وہی خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے۔

(الاسراء، ۱:۱۷)

کے کلمات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ خالق اور اس کے حبیب لبیب ﷺ کے سوا دوسرا اور کوئی نہ تھا اور عالم یہ تھا کہ حضور ﷺ خدا تعالیٰ کو بے حجاب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور اس کا کلام اپنے کانوں سے سن رہے تھے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کو دیکھ رہا تھا اور ان کا کلام بھی سن رہا تھا اس لئے حقیقت مصطفوی ﷺ کو خدا کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ ہماری محدود سوچ انوار رسالت کی پنہائیوں کو حیطہ شعور میں لانے سے قاصر ہے تو تجلیات انوارالٰہیہ کا ادراک ذہن انسان میں کیونکر سما سکتا ہے۔

بے مقصد مباحث

علمی موشگافیوں، فکری مغالطّوں اور بے مقصد مباحث سے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ابہام اور تشکیک کے گرد و غبار تخلیق کرتے رہنا علمی خیانت کے ذیل میں آتا ہے۔ مستشرقین نے اس علمی خیانت کو تخلیق کے لبادے میں چھپانے کی ناکام کوشش کی ہے لیکن حقائق کا چہرہ مسخ کرنے کی ناپاک کوشش جزوی طور پر بظاہر کامیاب ہو بھی جائے لیکن حقائق کو زیادہ دیر تک وقت کی نظروں سے اوجھل کئے رکھنا شاید کسی کے بس کی بات بھی نہیں کیونکہ رات کتنی بھی گہری اور تاریک کیوں نہ ہو سورج کے آگے دیوار کھینچنے میں ناکام رہتی ہے۔ آج مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کی گرد سے آلودہ فضا بھی صاف ہو رہی ہے کیونکہ گرد و غبار کو آخر پیوند زمیں بننا ہی ہوتا ہے۔

حضور ﷺ کی معراج کے بارے میں اہل علم نے اپنی اپنی ہمت اور بساط

کے مطابق علم کے بحر بے کنار میں غواصی کی اور جس کے ہاتھ جو کچھ آیا وہ مختلف اقوال کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ کسی نے کہا کہ حضور ﷺ کو مقامی اور روحانی معراج نصیب ہوا یعنی یہ کیفیت حالت خواب میں نصیب ہوئی۔ بعض کے نزدیک معراج متعدد بار ہوا۔ عالم بیداری میں ایک مرتبہ اور باقی ہر دفعہ حالت خواب مین، بعض کے خیال میں اسراء جسمانی طور پر اور معراج روحانی طور پر ہوا لیکن جمہور علماء بشمول صحابہ کرامؓ، تابعینؒ، محدثینؒ، فقہاءؒ، مفسرین اور متکلمین سب کا اس پر اجماع ہے کہ اسراء اور معراج دونوں جسمانی حالت میں ہوئے ہیں یعنی حضور ﷺ بنفس نفیس اپنے جسم اطہر کے ساتھ معراج کے لئے آسمانوں پر اور عالم لامکاں میں تشریف لے گئے۔ یہی قول حق ہے جس پر آج تک جمہور اہل ایمان قائم ہیں۔ یہ مباحث چھیڑ کر کہ حضور ﷺ کو جسمانی معراج نصیب ہوئی تھی یا روحانی عظمت مصطفیٰ ﷺ کو غبار تشکیک کی نذر کرنے کی گھناؤنی سازش تھی جسے اہل علم نے علمی سطح پر بھی مسترد کر دیا۔

معراج مصطفوی ﷺ کی تین حیثیات

سفر معراج کے تین مطالع اور مراحل حضور ﷺ کی تین شانوں اور حیثیتوں کا مظہر ہیں۔ یہ مراحل درج ذیل ہیں۔

۱-بشریت ۲-ملکیت و نورانیت ۳-مظہریت و حقیقت

۱-بشریت

حضور ﷺ اولاد آدم کی اصلاح کے لئے مبعوث ہونے والے انبیاء کے سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ اس عالم بشریت میں آپ نے اپنی حیات مقدسہ گزاری۔ اسی کرہ ارضی پر آپ نے ازدواجی زندگی بھی بسر کی، آپ کی بشریت کا انکار کفر ہے۔

حضورﷺ اس عالم آب وگل میں شان بشریت کے ساتھ جلوہ گر ہوئے تا کہ یہ عالم انس و جان آپﷺ کے فیوض و برکات سے مستفیض ہو سکے۔ بیت اللہ سے بیت المقدس کا سفر حضور اکرمﷺ کی بشریت کی معراج کا آئینہ دار ہے تا کہ یہ شان اپنے نقطہ کمال کو پہنچ جائے۔جشن عید میلا د حضورﷺ کی اسی بشریت کے جمالیاتی اور مجلسی اقرار کا نام ہے۔

۲۔ملکیت و نورانیت

حضورﷺ نور مجسم ہیں۔ آپﷺ کی نورانیت کا انکار بھی حد ادب کے منافی ہے۔ آپﷺ تو نور کائنات ہیں اور آپﷺ کا نور اور آپﷺ کی رحمت کائنات کی ہر شئے پر محیط ہے۔

مسجد اقصیٰ سے عالم افلاک میں سدرۃ المنتہیٰ تک کا سفر معراج حضورﷺ کی شان ملکیت و نورانیت کو اپنے منتہائے کمال تک پہنچانے کے لئے تھا تا کہ آپﷺ کی فیض رسانی سے عالم انوار و ارواح بھی محروم نہ رہے اور آپﷺ کا نور کائنات کی ہر شئے کو اپنے دامن رحمت میں سمیٹ لے۔

۳۔مظہریت و حقیقت

حقیقت محمدیﷺ کو خدا کے سوا کوئی نہ جان سکا کیونکہ ہماری عقل ناقص یا تو گمراہیوں کے جال بن سکتی ہے یا اپنے عجز کا اظہار کر سکتی ہے۔ سدرۃ المنتہیٰ سے ماوراء سفر معراج اس لئے کرایا گیا تا کہ آپﷺ کی شان محمدیت ذات حق تعالیٰ کی صفات اور حسن و جمال کا مظہر اتم بن جائے اور یہی معراج کا آخری منتہائے کمال ہے جس پر حضورﷺ کے کمالات محمدیﷺ کی انتہاء ہوگئی۔

فصل سوم

رؤیت باری تعالیٰ کی تحقیق

مسلمہ امور سے انحراف کر کے اپنی ذات کو نمایاں کرنے کی روش نے جہاں فکری مغالطّوں کو جنم دیا ہے وہاں بعض خود ساختہ دانشوروں نے اپنے قاری کے ذہن کو غبارِ تشکیک میں لپیٹ کر اعتقادی بے راہروی کی بنیاد بھی رکھی ہے۔ برصغیر میں برطانوی استعمار نے ہماری اسی مجلسی کمزوری کو دیکھتے ہوئے حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس کو بھی مباحثوں اور مناظروں کا موضوع بنا کر جس گھناؤنی سازش کا ارتکاب کیا تھا ہم اس کے منحوس اثرات سے آج تک چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے بلکہ یہ غلط روش حضور ﷺ کی ناآسودہ امت کو مختلف خانوں میں بانٹ کر ان کی اجتماعی قوت کو مفلوج کرنے کا باعث بنی ہے۔ اَفراط و تفریط کے اِسی موسم ناروا میں فرقہ واریت کا تھوہڑ خوب پنپا ہے۔

آیہ معراج کی تشریح کرتے ہوئے کچھ علماءِ تفسیر رؤیت کے بارے میں سخت مغالطے کا شکار ہوئے ہیں۔ وہ آیہ کریمہ میں دو کمانوں یا اس سے بھی کم باہمی قرب کو حضور ﷺ اور جبرئیل علیہ السلام کے درمیان قرب سے تعبیر کرتے ہیں۔ رؤیتِ باری تعالیٰ کو خارج از امکان قرار دیتے ہوئے اس گمان میں مبتلا ہیں کہ مقام **دنی فتدلی** اور **قاب قوسین او ادنی** پر حضور ﷺ کو جبرئیل علیہ السلام کا قرب اور اصل صورت میں دیدار نصیب ہوا۔

قابلِ غور امر یہ ہے کہ بفرضِ محال اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو کیا قرب حضرت جبرئیل علیہ السلام کی عظمت کا آئینہ دار ہے یا حضور ﷺ کی عظمت کا عکاس، جنہیں خالقِ موجودات نے بطور مہمانِ خصوصی معراج کے لئے بلوایا تھا، جبرئیل علیہ

السلام ان گنت بار حضورﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے رہتے تھے اور وہ بارگاہ حریم نبویﷺ میں بغیر اجازت داخل نہ ہوتے تھے۔ اگر معراج میں جبرئیل علیہ السلام کی عظمت کا اظہار مقصود ہوتا تو فی الواقع یہ معراج حضورﷺ کی بجائے جبرئیل علیہ السلام کی ہوتی۔ صحیح بخاری میں آیہ کریمہ مذکورہ کی تفسیر ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

دنی الجبار رب العزة فتدلی حتی کان منه قاب قوسین او ادنی	اللہ رب العزت اتنا قریب ہوا کہ دو کمانوں کے درمیان جتنا یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔

۱۔ صحیح البخاری، ۲: ۱۱۲۰، کتاب التوحید، رقم: ۷۰۷۹

حدیث مبارکہ سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ آیہ کریمہ میں وہ ذات جو حضور اکرمﷺ کے قریب ہوئی اس سے مراد رب العزت ہے جو جبار ہے۔

علماء میں ایک ایسا گروہ ہے جن کا عقیدہ ہے کہ معراج میں حضورﷺ کو باری تعالیٰ کا دیدار نہیں ہوا۔

انکارِ رؤیت کی دو ممکنہ صورتیں

پہلی صورت:۔ پہلی صورت یہ کہ اللہ کا دیدار سرے سے ممکن ہی نہیں اور انسانی آنکھ کو اتنی تاب کہاں کہ وہ اللہ کا دیدار کر سکے۔

دوسری صورت:۔ یہ کہ امکان تو موجود ہے لیکن شب معراج ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔

ان دونوں امکانی صورتوں کو جن کی بنا پر رؤیت باری تعالیٰ سے انکار کیا جاتا ہے ہم علماء کی طرف سے پیش کردہ ہر صورت کا قرآن و حدیث کی روشنی میں

جائزہ لیں گے۔

لَاتُدْرِکُهُ الْاَبْصَار کی تشریح

پہلی صورت میں قرآن حکیم کی جس آیہ مقدسہ کو رؤیت باری تعالیٰ کے عدم امکان کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ درج ذیل ہے۔

لاَ تُدْرِكُهُ الاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الاَبْصَارَ	نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کرسکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

(الانعام،۶:۱۰۳)

مذکورہ آیہ مقدسہ کا بالعموم یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ کسی آنکھ کو اتنی قدرت حاصل نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کر سکے۔ اس آیت سے یہ معنی مراد لینا اسے نہ سمجھنے کے مترادف ہے اس لئے کہ اس میں رؤیت کا نہیں بلکہ ادراک، کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ آیت کا معنی یہ ہوا کہ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ سب آنکھوں کا ادراک کرسکتا ہے اور ادراک دیکھنے کے معنی میں نہیں بلکہ کسی شئے کے احاطہ کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ دیکھنا اور بات ہے اور کسی چیز کا احاطہ کرنا دوسری بات ہے۔ مذکورہ آیہ کریمہ میں رب ذوالجلال نے اپنے دیکھے جانے کی نفی نہیں کی بلکہ ارشاد یہ ہوا ہے کہ عالم امکان میں ساری آنکھیں بھی مل کر اس کی ذات کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں اور صرف اسی کی ذات ہر چیز کا احاطہ کرنے پر قادر ہے لہٰذا ادراک سے دیکھنا مراد لے کر آیت کا یہ معنی نکالنا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار کسی آنکھ کے لئے ممکن ہی نہیں، چنداں درست نہیں۔

(مدارج النبوۃ،۱:۲۰۷)(شرح مسلم،۱:۹۷)

مثال:- اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے ایک مثال یوں دی جا سکتی ہے۔ ایک مقرر جم غفیر سے خطاب کر رہا ہے۔ مجمع دور تک پھیلا ہوا ہے جسے وہ دیکھ تو سکتا ہے لیکن سب حاضرین جلسہ کا وہ احاطہ نہیں کر سکتا۔ جو لوگ سامنے اس کے قریب ہیں انہیں وہ دیکھتا ہے لیکن جو لوگ پس دیوار ہیں وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ اس سے یہ نکتہ کھلتا ہے کہ کوئی محدود وجود غیر محدود وجود کو دیکھ تو سکتا ہے مگر اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ کسی جزو کو یہ طاقت حاصل نہیں کہ وہ کل کا احاطہ کر سکے۔ پس ذات خداوندی جو غیر محدود اور کل ہے اس کا احاطہ سب انسانی آنکھیں جو محدود اور جزو ہیں مل کر بھی نہیں کر سکتیں جبکہ وہ ذات ہر شئے کا احاطہ کرنے پر قادر ہے۔ اس ساری گفتگو سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالٰی کا دیدار اور مشاہدہ عین ممکن ہے مگر اس کا ادراک ممکن نہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کا موقف

اس سلسلہ میں حضور اکرم ﷺ کے برگزیدہ صحابی حضرت عبداللہ ابن عباسؓ جن کی قرآن فہمی مشہور خاص و عام تھی اور جنہیں صاحب قرآن نے ترجمان القرآن کے خطاب سے نوازا تھا، انہوں نے ان صحابہؓ سے جو مذکورہ آیت سے نفی رؤیت کی دلیل لاتے تھے اختلاف کیا اور فرمایا کہ اس آیت میں رؤیت کی نہیں بلکہ ذات باری تعالٰی کے ادراک کی نفی کی گئی ہے۔

دوسری آیت کی تشریح

دوسری آیہ کریمہ نفی رؤیت کے لئے جس کا سہارا لیا جاتا ہے وہ یہ ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْياً اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلاً

(الشوریٰ،۴۲:۵۱)

اور کسی آدمی کی طاقت نہیں کہ اللہ اس سے (براہ راست) بات کرے مگر ہاں (اس کی تین صورتیں ہیں یا تو) وحی (کے ذریعے) یا پردے کے پیچھے سے یا (اللہ) کسی فرشتے کو بھیج دے۔

علماء نے اس آیت کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ کسی بشر کی مجال نہیں کہ وہ بے حجاب اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہو سکے اس لئے اس کا دیدار بے حجاب ممکن ہی نہیں۔ اس دلیل کی بنا پر وہ تسلیم نہیں کرتے کہ شب معراج آنحضور ﷺ نے ذات باری تعالیٰ کا بے حجاب دیدار کیا۔ اس آیت کو سمجھنے میں ان سے وہی مغالطہ سرزد ہوا جو سابقہ آیت کو سمجھنے میں ہوا تھا۔ صحیح بات یہ ہے کہ آیت کریمہ میں بے حجاب کلام کی نفی کی گئی ہے نہ کہ بے حجاب مشاہدے کی، جبکہ اس میں دیدار اور مشاہدے کا نہیں بلکہ بے حجاب کلام کا ذکر ہے اور یہ تو نہیں کہا گیا کہ اللہ کو طاقت نہیں کہ وہ اپنا دیدار کسی کو بے حجاب کرا سکے۔ چونکہ اس آیت میں خدا کی نہیں بلکہ بشر کی طاقت کی نفی کی جا رہی ہے اس لئے اسے شب معراج حضور ﷺ کے دیدار الٰہی کی نفی کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔

سفرِ معراج ربِ کائنات کی قدرتِ کاملہ کا مظہر

ہم نے گذشتہ صفحات میں بیان کیا ہے کہ معجزہ معراج کا انکار اللہ رب العزت کی قدرت کاملہ کا انکار ہے کیونکہ خدائے رحیم و کریم، کائنات کا ہر ذرہ جس کے حکم کا پابند ہے نے اپنے محبوب رسول حضرت محمد ﷺ کو جبرئیل امین کے ذریعہ براق بھیج کر بلوایا اور انہیں آسمانوں کی سیر کرائی کہ محبوب تیری چادرِ رحمت کائنات کی ہر شئے پر محیط ہے۔ قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ پر اِستعجاب کیسا؟

واقعہ معراج کو قرآن نے اول تا آخر خدائے لم یزل کی قدرت کاملہ قرار دیا ہے اسی لئے اس قصے کو سبحان الذی سے شروع کیا تا کہ ذہن میں کسی قسم کا خلجان باقی نہ رہے کہ اس واقعہ کی ذمہ داری اس عظیم و برتر ذات پر ہے جو ہر قسم کی کمزوری، نقص اور عیب سے پاک ہے اور بلا شرکتِ غیرے اس بات پر قادر ہے کہ وہ معراج جیسا عظیم و بے مثال سفر کرا سکے۔ اگر دعویٰ کسی فرد بشر کی طرف سے ہوتا کہ میں نے اپنی طاقت اور صلاحیت کے بل بوتے پر معراج کیا تو معاملے کی صورت مختلف ہوتی لیکن یہاں تو بات ہی اور ہے۔ خدا تعالیٰ اپنی ذات کو ہر کمزوری، عیب اور سقم سے پاک قرار دے کر معراج کو اپنی طاقت اور قدرت کاملہ سے منسوب کر رہا ہے لہٰذا یہ بحث کہ رویت باری تعالیٰ کس طرح ممکن ہے خود خالقِ مطلق کی قدرت و اختیار کے دائرے کو زیر بحث لانے کے مترادف ہو گا لیکن خدا کی قدرت و طاقت کا اندازہ انسان کے حیطہ ادراک سے باہر ہے۔ اگر واقعہ معراج کی صحت کی کسوٹی انسان کی طاقت و قدرت ہو تو پھر یہ سارا معاملہ انسان کی دسترس اور دائرہ اختیار سے باہر ہے لیکن جہاں خدا کی قدرت اور اختیار کی بات آ جائے تو پھر اس واقعہ کی مختلف جہتوں سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔

قرآن و حدیث کی روایات کی من مانی تاویل سے واقعہ معراج کی عظمت سے روگردانی کا پہلو نکلتا ہے۔ معجزہ معراج کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے سے ممکن و ناممکن کی لایعنی بحث کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ پھر بیت المقدس کے سفر، آسمانوں اور عالمِ اُخروی کے مشاہدات کی عقلی توجیہہ ذہن میں ان گنت سوال چھوڑ جاتی ہے۔ معجزہ تو ہے ہی وہ خرق عادت واقعہ جو عقل میں نہ آ سکے۔ اسے دلیل نبوت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ بنابریں حضور ﷺ کے ایک معجزے کا انکار سارے معجزات کا انکار اور خود رسالت کا انکار سمجھا جائے گا۔

انکارِ رؤیت کی تیسری دلیل

منکرین رؤیتِ باری تعالیٰ اِس حدیث کے حوالے سے دیتے ہیں جس میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ جب ان سے معراج میں حضورﷺ کے دیدار الٰہی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ جب آنحضورﷺ سے یہ سوال کیا گیا تو انہوں نے ارشاد فرمایا۔

نورٌ اَنّٰی أَرَاہٗ۔ وہ تو نور تھا میں بھلا اسے کیسے دیکھ سکتا تھا۔

(الصحیح لمسلم، ۹۹:۱، کتاب الایمان، رقم:۲۹۱)

اس حدیث مبارکہ کا ترجمہ بالعموم یہی کیا جاتا ہے اور اسی سے وہ نفی رؤیت کا استدال کرتے ہیں۔ اگر ہم گہرائی میں جا کر حضورﷺ کے ارشاد گرامی پر غور کریں تو اس کا یہ معنی نہیں جو بادی النظر میں سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس سے اگلی حدیث میں حضورﷺ نے اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے کہ

رایت نورا میں نے نور کو دیکھا۔

(الصحیح لمسلم، ۹۹:۱، کتاب الایمان، رقم:۲۹۲)

اس کی روشنی میں متذکرہ بالا حدیث کا معنی یہ ہوا کہ میں نے جس طرف سے بھی دیکھا اسے نور پایا۔ یہ معنی نہیں کہ وہ نور تھا میں اسے کیسے دیکھ سکتا تھا۔ رأیت نورا کے الفاظ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ حضورﷺ دیدار الٰہی کا اثبات کرتے ہوئے اس کی کیفیت بیان کر رہے ہیں کہ ذات باری تعالیٰ کو جس طرف سے بھی دیکھا نورٌ علٰی نور پایا۔

اللہ تعالیٰ خالق نور ہے

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نور اپنی ماہیت کے اعتبار سے وہ چیز ہے جس کو دیکھا نہیں جا سکتا بلکہ اس کی مدد سے اشیاء نظر آتی ہیں لہٰذا اللہ کے نور کا دیدار چہ معنی دارد؟ اس کا جواب یہ ہے کہ باری تعالیٰ کی ماہیت کو نور قرار دینا اصلاً غلط ہوگا کیونکہ بشر کی طرح نور بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے جسے اپنی ذات کے اعتبار سے کسی جہت اور ہیئت میں مقید نہیں کیا جا سکتا اس لئے بعض علماء کے نزدیک اللہ کو نور کہنا کفر کے مترادف ہے۔ بے شک وہ اللہ تعالیٰ خالق نور ہے کہ وہ بشر اور دیگر مخلوقات کا خالق ہے مگر جب باری تعالیٰ نے اپنا تعارف قرآن پاک میں اس طرح کرایا ہے کہ

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرْضِ ط   اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

(النور، ۲۴:۳۵)

تو مفسرین قرآن اور ائمہ کرام نے اس کا معنی مراد یہ لیا ہے کہ وہ ذات جو آسمانون اور زمین کو روشن کرنے والی ہے لہٰذا آیت کریمہ میں مجازاً سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ کو نور سے تعبیر کیا ہے جس سے مراد اس کی تجلی ذات ہے نہ کہ اس کی ماہیت۔

حضور ﷺ نے اللہ کا دیدار کیا تو اس کے جلوہ ذات کی کیفیت کو نور کی مانند پایا جس نے ہر چیز کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ یہی ''نورانی اراہ'' کا مفہوم ہے اور اس کی کیفیت کو جس کا حضور ﷺ نے شب معراج مشاہدہ کیا دیدار الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اِمکانِ رؤیتِ باری تعالیٰ

رؤیتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں یہ خیال عام ہے کہ اس دنیا میں اللہ کو دیکھنا

ممکن نہیں ہے اور بطور انعام دیدارِ الٰہی محض آخرت کا حصہ ہے۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم کی دو آیات کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہوگا جس سے اس دنیا میں دیدارِ الٰہی کی اِمکانی صورت واضح ہو جائے گی۔

قرآن کریم کی پہلی آیت کا محل موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کا بارگاہ رب العزت میں دیدار کے لئے خواستگار ہونا ہے۔ وہ سراپا سوال بن کر باری تعالیٰ کے حضور اِستدعا کرتے نظر آتے ہیں۔

رَبِّ اَرِنِی اَنْظُرْ اِلَیْکَ ط — اے رب! مجھے (اپنا جلوہ) دکھا کہ میں تیرا دیدار کرلوں۔
(الاعراف، ۷:۱۴۳)

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی جنہیں بارہا اپنے رب سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا ہے، اس بات سے آگاہ نہیں تھے کہ وہ دیدارِ الٰہی کا مطالبہ کر کے ایسی چیز کا تقاضا کر رہے ہیں جو سرے سے ممکن ہی نہیں؟ جناب کلیم اللہ کا رؤیت باری تعالیٰ کے عدم امکان کے بارے میں بے خبر ہونا بعید از فہم ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا بارہا خدا کے حضور دیدار کا تقاضا کرنا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ علی وجہ البصیرت ان کا اعتقاد تھا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار اس دنیا میں عین ممکن ہے۔ یہی سبب ہے کہ سر طور رب ارنی کی صدا بلند کرتے رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس التجا کے جواب میں باری تعالیٰ نے جو ارشاد فرمایا وہ بھی غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ خدا کی طرف سے اپنے کلیم کو خطاب فرمایا گیا۔

لَنْ تَرَانِیْ — تم مجھے (براہِ راست) ہرگز دیکھ نہ سکو گے۔
(الاعراف، ۷:۱۴۳)

جواب کی نوعیت پر غور کریں تو اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ مجھے دیکھا نہیں

جا سکتا بلکہ ارشاد فرمایا کہ اے موسیٰ! تیری آنکھ مجھے دیکھنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہ نہیں کہا کہ کوئی آنکھ مجھے دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ اس سے امکان رؤیت کی نفی نہیں ہوتی بلکہ اس فرمودہ خداوندی میں اس بات کا اثبات مضمر ہے کہ میرے دیدار کا شرف معراج کی شب صرف میرا حبیب ﷺ حاصل کرے گا۔ قضا وقدر نے یہ شرف و امتیاز حضور سرور کائنات فخر موجودات ﷺ کے حصے میں رکھا ہے۔ یہی سبب تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی التجا کو شرف پذیرائی نہ بخشا گیا کیونکہ اس سعادت کے لئے ازل سے نبی اکرم ﷺ کی ذات ستودہ صفات کو منتخب کیا جا چکا تھا۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

دوسری آیت میں اہل جنت کے لئے مژدہ ہے کہ انہیں اللہ رب العزت اپنے دیدار سے نوازیں گے۔ ارشاد ربانی ہے:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ o اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ o	کتنے چہرے اس روز تر و تازہ ہونگے o اپنے پروردگار کے دیدار میں محو ہوں گے o
(القیامۃ، ۷۵:۲۲-۲۳)	

بموجب ارشاد خداوندی اہل خلد کے تر و تازہ چہروں پر بشاشت کی لہر دوڑ جائے گی جب انہیں خدا کا دیدارِ عام بے حجاب کرایا جائے گا۔ رسول عربی ﷺ نے فرمایا کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے بے حجاب دیدار سے بڑھ کر اور کوئی نعمت اہل ایمان کے لئے نہ ہوگی۔

رؤیتِ باری پر متفق علیہ حدیث

حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

انکم سترون ربکم عیانا بے شک تم اپنے رب کو اعلانیہ دیکھو گے۔

۱۔صحیح البخاری، ۲:۱۱۰۵، کتاب التوحید، رقم:۶۹۹۸

۲۔مسند احمد بن حنبل، ۳:۱۶

حضرت جریر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ چودھویں کے چاند کی رات ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا:

انکم سترون ربکم یوم القیامة کما ترون القمر ھذا تم اپنے رب کو دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھتے ہو۔

۱۔صحیح البخاری، ۲:۱۱۰۶، کتاب التوحید، رقم:

۲۔سنن ابی داؤد، ۲:۳۰۲، کتاب السنة، رقم:۴۷۲۹

۳۔سنن ابن ماجہ، ۱:۶۳، رقم:۱۷۷

۴۔مسند احمد بن حنبل، ۴:۳۶۰

اس سے یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ مندرجہ بالا ارشادات مصطفوی ﷺ کی رو سے ذات باری تعالیٰ کے مطلقاً دیدار کی نفی نہیں ہوئی۔ اب اگر بالفرض اس کے عدم امکان کو تسلیم کر لیا جائے تو منطق کے اصول کے مطابق جو چیز اس جہان میں ناممکن ہے وہ عالم اخروی میں بھی ناممکن ہے لیکن بفحوائے ارشاد رسول مقبول ﷺ ہر مومن کے لئے آخرت میں سب سے بڑی نعمت دیدار خداوندی ہوگا۔

دولتِ دیدارِ الٰہی حضور ﷺ کے لئے مختص تھی

یہ بات کسی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ حضور ﷺ کا مقام اپنے ہر ایمان دار

امتی سے بدرجۂ اَتم کہیں بڑھ کر ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ ہر مومن کو ایمان کی دولت ان کے صدقے سے عطا ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے یہ منفرد امتیاز صرف حضور ﷺ کی ذات کو حاصل ہے کہ انہیں معراج کی شب مشاہدہ و دیدارِ حق نصیب ہوا جبکہ دوسرے اہل ایمان کو یہ سعادت آخرت میں نصیب ہو گی۔ احادیث میں ہے کہ معراج کے دوران آنحضرت ﷺ کو احوالِ آخرت، جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرایا گیا جبکہ باقی سب کو ان کا چشم دید مشاہدہ موت کے بعد کرایا جائے گا۔ بلاشبہ یہ حضور ﷺ کے کمالات میں شامل ہے کہ انہیں قیامت تک پیش آنے والے واقعات کی پیشگی مشاہدے کے ذریعے خبر دے دی گئی اور آخرت کے سب احوال ان پر بے نقاب کر دیئے گئے۔ اس بنا پر تسلیم کر لینے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے کہ منجملہ کمالات میں سے یہ کمال صرف حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہوا کہ دیدارِ الٰہی کی وہ عظمتِ عظمیٰ جو مومنوں کو آخرت میں عطا ہو گی وہ آپ کو شبِ معراج ارزانی فرما دی گئی۔ یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا کہ چھوٹی نعمتوں کے باوصف سب سے بڑی نعمت جو دیدارِ الٰہی ہے اس سے حضور ﷺ کو محروم کر دیا جاتا۔

امکان کی بات سے قطع نظر سورہ نجم کی آیات معراج میں چار مقامات ایسے ہیں جن میں ذاتِ باری تعالیٰ کے حسنِ مطلق کے دیدار کا ذکر کیا گیا ہے۔

ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی o فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی o (النجم، ۵۳:۸-۹)	پھر قریب ہوا (اللہ محمد ﷺ سے) پھر زیادہ قریب ہوا تو (محمد ﷺ اپنے رب سے) دو کمانوں کی مقدار (نزدیک) ہوئے بلکہ اس سے (بھی) زیادہ قریب۔

ارشادِ ربانی میں اس انتہائی درجے کے قرب کی نشاندہی کی گئی ہے جس کا

حتمی نتیجہ اور نقطۂ منتہی سوائے دیدارِ الٰہی کے اور کچھ قرینِ فہم نہیں۔ اس کے بعد فرمایا۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ○ — قلب مبارک نے اس کے خلاف نہ کہا جو (چشم اقدس نے) دیکھا○

(النجم، ۵۳:۱۱)

قرآن حکیم نے یہ واضح فرما دیا کہ شب معراج حضور ﷺ نے جمال ذات باری تعالیٰ کا مشاہدہ دل کی آنکھ سے بھی کیا اور سر کی آنکھ سے بھی۔

دیدارِ الٰہی کے بارے میں علماءِ امت کی تصریحات

حدیث طبرانی میں ہے کہ

ان محمدا رای ربه مرتين مرة بعينه و مرة بفواده۔

حضور ﷺ نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا۔ ایک مرتبہ آنکھ سے اور ایک مرتبہ دل سے۔

۱۔ المعجم الکبیر، ۱۲:۷۱، رقم: ۱۲۵۶۴

۲۔ المعجم الاوسط، ۶:۳۵۶، رقم: ۵۷۵۷

۳۔ المواہب اللدنیہ، ۲:۳۷

۴۔ نشر الطیب: ۵۵

اس حدیث پاک سے رؤیت باری تعالیٰ کے بارے میں اوپر درج کی گئی قرآنی آیات کے مضمون کی بخوبی تائید ہوتی ہے۔

حضرت امام حسن بصریؒ جو حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت حسانؓ جیسے برگزیدہ اصحاب رسول کی صحبت سے فیض یافتہ نامور تابعی ہیں، ان سے ایک بار حضور ﷺ کے بارے میں سوال کیا گیا کہ آیا انہوں نے معراج کی شب ذات باری تعالیٰ کا دیدار کیا؟ تو انہوں نے تین بار قسم کھا کر اس بات کا اقرار کیا کہ ہاں انہوں نے اپنے رب کو دیکھا ہے۔

اسی طرح جب امام احمد بن حنبلؒ سے حضور ﷺ کی روٴیت باری تعالیٰ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے تین بار یہ الفاظ دہرائے، **قد رأی ربہ** یعنی انہوں نے اپنے رب کو دیکھا، یہاں تک کہ ان کی سانس پھول گئی۔

یہ خیالات و معتقدات سب ممتاز اور قابل ذکر صحابہ، صحابیات، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ کرام کے ہیں۔ قرآن حکیم نے روٴیت باری کی تائید فرماتے ہوئے شک کرنے والوں سے پوچھا۔

اَفَتُمَارُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی o	کیا تم ان سے اس پر جھگڑتے ہو جو
(النجم، ۵۳:۱۲)	انہوں نے دیکھاo

سرور دوجہاں، ہادی انس و جاں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری آنکھ کے علاوہ ایک آنکھ باطنی دل کی بھی عطا فرمائی تھی۔ جب ساعت دیدار آئی تو آپ ﷺ کو ظاہری جلوہ اور باطنی جلوہ دونوں نصیب ہوئے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی o	اور بے شک انہوں نے اسے دوسری
(النجم، ۵۳:۱۳)	بار ضرور دیکھاo

بارگاہِ خداوندی میں مسلسل حاضری

اس سے پہلے یہ ذکر آ چکا ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ اپنے خالق و مالک سے وصال و دیدار کی نعمتوں سے مالا مال ہونے کے بعد سفلی دنیا کی طرف لوٹے تو اللہ جل مجدہ کی طرف سے امت کے لئے پچاس نمازوں اور چھ ماہ کے روزوں کا تحفہ لائے۔ راستے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو ان کے استفسار پر حضور ﷺ

نے انہیں صورتحال سے مطلع فرمایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اصرار کر کے آنحضورﷺ کو بار بار رب تعالیٰ کے ہاں بھیجتے رہے یہاں تک کہ آپ نے ۹ مرتبہ ذات باری تعالیٰ سے ملاقات کی جس کے نتیجے میں اللہ رب العزت نے تخفیف فرما کر پانچ نمازیں اور ایک ماہ کے روزے امت مسلمہ پر فرض کئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مزید تخفیف کے بارے میں اصرار کیا تو آپﷺ نے فرمایا کہ مجھے اب دسویں مرتبہ رب کے ہاں جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ حضور اکرمﷺ کو نو مرتبہ دیدار اور ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا۔

چشمانِ مصطفیٰﷺ دیدارِ الٰہی میں محو تھیں

حضورﷺ کی چشمانِ مبارک جو دیدارِ الٰہی کے شرف سے مشرف ہوئیں، کائنات سماوی کا ایک ایک نقش جن میں ثبت ہے، کتاب زندگی کے سرورق کا وہ جلی عنوان ہے جو ان گنت کائناتی سچائیوں کے انکشاف کا نقیب ہے، انہیں چشمان مبارک کے تصدق میں کائنات رنگ و بو میں رعنائیوں کے جھرمٹ اترتے ہیں، انہی چشمان مقدس میں موسیٰ علیہ السلام کی آرزو، انوار و تجلیات الٰہیہ کی صورت میں جاگزیں ہے اور یہی چشمان مقدس سدرۃ المنتہیٰ کے جمال کی عینی شاہد ہیں۔

کلام ربانی میں آقائے دوجہاںﷺ کی ان مبارک آنکھوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو اپنے حوصلے، اعتماد، ہمت اور عزم و یقین کے باعث اس ارشاد ربانی کا مصداق ٹھہریں۔

مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی o نگاہ جھپکی نہ حد سے بڑھی (جس کو دیکھنا تھا اس پر جمی رہی)o

(النجم، ۵۳:۱۷)

آپﷺ کی بصارت اس درجہ طاقت و وسعت کی حامل تھی کہ شب معراج

مشاہدہ حق کے وقت اس میں نہ صرف اضمحلال واقع نہ ہوا بلکہ وہ کمال ہوش کے ساتھ مشاہدہ جمال میں محو رہی۔

حضرت سہل بن عبداللہ التستریؒ اسی مشاہدہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

شاهد نفسه والی مشاهدتها و انما كان مشاهدا ربه تعالی بشاهد ما يظهر عليه من الصفات التی اوجبت الثبوت فی ذلک المحل	اس طرح مستغرق ہوئے کہ سوائے ذات باری اور صفات الٰہیہ کے کسی طرف متوجہ نہ ہوئے۔

(روح المعانی، ۲۷:۵۴)

اس کے برعکس حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہ طور پر تجلی الٰہی کی ایک جھلک بھی برداشت نہ کر سکے اور صفاتی تجلی کی انعکاسی شعاع کے اثر سے آپ علیہ السلام کا خرمن ہوش جل گیا۔

کسی صاحب نظر نے بصارت مصطفوی ﷺ کا بصارت موسیٰ علیہ السلام سے کیا خوبصورت موازنہ کیا ہے۔

موسیٰ ز ہوش رفت بہ یک پر تو صفات
تو عین ذات می نگری در تبسمی

قرآن آگے چل کر روئیت آیات الٰہیہ کے باب میں حضور ﷺ کے کمال بصارت کا ذکر بایں الفاظ کرتا ہے۔

لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیَاتِ رَبِّہٖ الْکُبْرٰی o (النجم، ۵۳:۱۸)	بے شک آپ ﷺ نے اپنے رب کی بے شمار نشانیاں دیکھیں o

حضور ختمی مرتبت ﷺ کی چشمان مقدس کی عظمت کا اندازہ اس بات سے

لگایا جا سکتا ہے کہ ان چشمان مقدس نے اللہ رب العزت کا بے حجاب نظارہ کیا۔ اب اس کے بعد وہ کونسی چیز ہوگی جو حضور ﷺ کی چشم بینا سے پوشیدہ رہی ہوگی۔ یہی چشم بینا کائنات کی ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ماضی، حال کے علاوہ مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات اور تغیرات حضور ﷺ کی چشمان مبارک پر روز روشن کی طرح واضح اور نمایاں تھے۔

دل نے تجلیاتِ الٰہیہ کی تصدیق کی

حضور ﷺ کے کمال بصارت کے ذکر کے بعد قرآن آپ ﷺ کے قلب انور کا ذکر بھی کرتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى o	قلب مبارک نے اس کے خلاف نہ کہا جو (چشم اقدس نے) دیکھا o
(النجم، ۵۳:۱۱)	

سفرِ مراجعت

معراج سے واپسی کا سفر براق پر طے ہوا اور حضور ﷺ بیت المقدس کی راہ سے حرم کعبہ میں تشریف لائے۔ رات کی وہی تاریکی تھی جب آپ بستر پر محو استراحت ہوئے۔ وہ ایک لمحہ جو کائنات ارضی و سماوی کی زمانی و مکانی وسعتوں کو محیط تھا اپنے دامن میں معراج کی عظمتوں اور رفعتوں کو سمیٹے ہوئے تھا۔

حضور ﷺ کے خواب اور بیداری کے بارے میں حدیث پاک کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

واستيقظ وهو في مسجد الحرام۔	میں بیدار ہوا حالانکہ میں مسجد حرام میں تھا۔

(صحیح البخاری، ۲:۱۱۲۰، کتاب التوحید، رقم:۷۰۷۹)

اس حدیث مبارکہ سے کچھ لوگ مغالطے کا شکار ہو گئے اور انہیں واقعہ معراج میں تضاد دکھائی دینے لگا۔ لوگوں پر وارد ہونے والے اشکال کا جواب ائمہ کرام (جن میں امام ترمذی، امام عسقلانی اور امام قسطلانی رحمھم اللہ تعالیٰ کے نام قابل ذکر ہیں) نے اپنی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ دیا ہے لیکن وہ جن کی سوچ میں کجی اور عدم مطالعہ کی بنا پر جن کا مبلغ علم محدود ہے انہیں واقعہ معراج میں سوائے تضادات کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔

سفر معراج پر روانہ ہونا بھی عظمت مصطفیٰ ﷺ کی دلیل ہے اور سفر معراج سے مراجعت یعنی اس کرہ ارضی کی طرف واپسی بھی شوکت حبیب خدا ﷺ کی مظہر ہے۔ جن عجائبات کا آپ نے اس سفر میں مشاہدہ کیا وہ بھی رسول کائنات ﷺ کی شان کو دوبالا کرنے کے لئے تھے۔ سفر معراج سے عروج آدم خاکی کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ علوم جدیدہ نے جن کائناتی سچائیوں کو بے نقاب کیا ہے ان میں سفر معراج بھی شامل ہے۔ اگر تمام تعصّبات سے بالاتر ہو کر دیکھا جائے کہ کائنات کی بے کراں وسعتوں میں تاجدار کائنات ﷺ کے قدوم مقدسہ کی تلاش ہی جدید سائنسی انکشافات کی بنیاد ہے۔ دنیا اس حقیقت کا بلا واسطہ اعتراف نہیں کرے گی کہ آج کا انسان اپنی تمام آزاد خیالی کے سفلی اور علاقائی تعصّبات سے دامن نہیں چھڑا سکا۔ حضور ﷺ نے قرآنی اور انسانی بنیادوں پر جس وسیع معاشرے کی بنیاد رکھی تھی دنیا شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر ان اہداف کے حصول کے لئے مصروف عمل ہے۔ اگر سفر معراج کو جدید سائنسی انکشافات کی بنیاد قرار دیا جائے تو یہ اس عظیم معجزہ کے محض ایک پہلو کا اعتراف ہو گا لیکن جوں جوں سائنس ترقی کرے گی ذہن انسانی میں تحقیق و جستجو کے نئے نئے دروازے کھلیں گے توں توں سفر معراج کے حوالے سے ان گنت کائناتی پیچیدگیاں خود بخود حل ہوتی جائیں گی اور حضور ﷺ کا یہ زندہ معجزہ اللہ رب العزت کی قدرت

مطلقہ کا مظہر بن کر شاہراہ حیات کا وہ سنگ میل ثابت ہوگا کہ جسے بوسہ دیئے بغیر ارتقاء کے سفر پر روانہ ہونے والا انسان ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکے گا۔ سفر معراج عروج آدم خاکی وہ دروازہ ہے جس میں داخل ہوئے بغیر انسان پتھر اور دھات کے زمانے کی طرف تو لوٹ سکتا ہے ارتقاء کی سیڑھی کے پہلے زینے پر بھی قدم نہیں رکھ سکتا۔

فصل چہارم

ازالہ شبہات

گزشتہ حصے میں واقعہ معراج کے سرتا پا معجزہ ہونے کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے اس تفصیل کی روشنی میں یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگی ہے معجزہ معراج اتنا محیر العقول ہے کہ اس کا کوئی پہلو حیطہ ادراک میں نہیں آ سکتا اور یہاں عقل کو اظہارِ عجز کے سوا کوئی دوسرا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔

واقعہ معراج کی تفصیلات ہزار ہا کتبِ حدیث وسیر میں بکھری پڑی ہیں اور جب تک دقت نظر سے ان کا مطالعہ نہ کیا جائے حقیقت معراج کی تہہ تک پہنچنا ممکن ومحال ہے یہاں ہم ان شبہات کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیں گے جو کم علمی اور قلت مطالعہ کی بنا پر واقعہ معراج کے بارے میں بعض لوگوں کے ذہنوں میں وارد ہوتے ہیں۔ان شبہات کا عملی جائزہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ایمان وایقان کی روشنی غبار تشکیک کی ردائے بے شعور کی دستبرد سے محفوظ رہے۔

پہلا شبہ معراج جسمانی یا روحانی

سب سے بڑا شبہ نفسِ معراج کے بارے میں اکثر لوگوں کو اس امر میں ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کا معراج جسمانی تھا یا روحانی اور مقامی تھا۔ دوسرے لفظوں میں کیا حضور ﷺ جسم اطہر کے ساتھ عالمِ آب وگل سے عالم اُفلاک میں تشریف لے گئے تھے یا محض خواب کی حالت میں روحانی طور پر معراج ہوئی؟ یہ شبہ اس لئے ہوا کہ لوگوں نے قرآن وحدیث میں درج کردہ واقعہ معراج کی تفصیلات پر اعتماد کرنے کی بجائے اپنی محدود اور ناقص عقل وفہم کی کسوٹی پر اسے پرکھنے کی کوشش کی اور چونکہ ان کے وضع کردہ

عقل وفہم کے پیمانوں پر اس کی تفصیلات پوری نہ اترتی تھیں اس لئے ان کا ذہن معراجِ جسمانی کو تسلیم کرنے سے انکار کرنے لگا اور انہوں نے اس واقعہ کو روحانی اور مقامی معراج سے تعبیر کر کے اس حقیقت سے صرف نظر کر لیا کہ معجزہ تو وہ خرق عادت واقعہ ہوتا ہے جس کی عقلی توجیہہ سرے سے ناممکن ہو اور واقعہ معراج وہ عظیم ترین معجزہ ہے عقل جس کا ادراک کرنے سے یکسر قاصر ہے۔

جسمانی معراج کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ حالت خواب کی واردات ہوتی تو کفار و مشرکین مکہ اسے ماننے سے کبھی پس و پیش نہ کرتے۔ ان کا تو انکار ہی اس بنا پر تھا کہ حضور ﷺ کا اپنے جسم اطہر کے ساتھ مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ اور افلاک پر جانا ان کی عقل وفہم سے بالاتر تھا۔ خوابی کیفیات پر انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

دوسرا شبہ انتہائے سفر معراج

معراج النبی ﷺ کے بارے میں دوسرا شبہ لوگوں کو اس بارے میں ہوا کہ حضور ﷺ کا منتہائے سفر کیا تھا؟ کسی نے کہا آپ ﷺ آسمان تک پہنچ کر واپس لوٹ آئے بعض کے نزدیک آپ سدرۃ المنتھیٰ تک گئے اور بعض نے آپ کا عرش معلے اور اس سے ماوراء عالم لامکاں تک عروج اور ذات خداوندی کے بے حجاب دیدار کو تسلیم کیا ہے۔ اس اختلاف اور شبے کی ایک وجہ بادی النظر میں یہ ہے کہ اس واقعہ کو قرآن حکیم اور احادیث میں کہیں اجمال اور کہیں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قرآنی اسلوب رمز وایما اور پیرایہ بیان صراحت کی بجائے کنایہ کا انداز لئے ہوئے ہے۔ اس کی شرح تفسیر کی ہزارہا کتب میں ہے جس تک رسائی کے لئے ورق گردانی اور دیدہ ریزی ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔

واقعہ معراج کے تذکرے میں کہیں حقیقت اور کہیں مجاز کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس بارے میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ احکام ہمیشہ عبارت النص سے ہی مستنبط نہیں ہوا کرتے بلکہ ان کے اخذ کرنے کے مختلف اسالیب ہیں جن کو قرآن وسنت پر گہری نظر رکھے بغیر سمجھنا

از بس مشکل ہے۔ اس کے نتیجے میں شبہات کا وارد ہونا کوئی بعید از فہم بات نہیں۔

تیسرا شبہ معراج کی غرض و غایت

واقعہ معراج کی تفہیم میں تیسرا شبہ بعض اہل علم کو یہ وارد ہوا کہ معراج کی غرض و غایت کیا تھی؟ اور اس کے پیچھے کون سے مقاصد کارفرما تھے؟ اس سلسلے میں اربابِ فکر و نظر کے درمیان خاصہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ معراج کی شب حضور ﷺ کس ہستی کے دیدار سے شاد کام ہو کر دنیائے ارضی کی طرف لوٹے؟ کسی نے کہا کہ آپ ﷺ نے سدرۃ المنتھی پر جبرئیل کو اپنی اصل شکل و صورت میں دیکھا۔ بعض کے نزدیک معراج کا مقصد ذات باری تعالیٰ کی قدرتوں کا مشاہدہ اور اس کا بے حجاب دیدار تھا۔ ان تین شبہات اور اختلافی نقطہ ہائے نظر پر ہم آئندہ صفحات میں شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کریں گے تاکہ واقعہ معراج کی عظمت کے صحیح خدوخال اجاگر ہو سکیں۔

امر واقع یہ ہے کہ انسانی عقل و شعور کے ارتقاء اور سائنسی ایجادات وانکشافات کے نتیجے میں جن علمی، استخراجی اور استقرائی رویوں نے جنم لیا ہے ان سے واقعات معراج کے زمانی و مکانی پہلوؤں کو سمجھنا نسبتاً آسان ہو گیا ہے اور جوں جوں علم و دانش کی روشنی پھیلے گی قلوب و اذہان پر واقعہ معراج کی حقیقت اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ آشکار ہوتی جائے گی۔

گذشتہ باب میں واقعہ معراج کے مختلف پہلوؤں پر رائے زنی کے بارے میں ہم اس بات کی خصوصیت کے ساتھ وضاحت کر چکے ہیں کہ تفسیر و حدیث کی چند کتابوں کے مطالعہ پر اکتفا کر لینے سے معراج کی حقیقت کو سمجھ لینے کا دعویٰ خام خیالی ہے اس کی تفصیلات کے لئے بیسیوں کتابوں کو کھنگالنا پڑے گا۔ قلتِ مطالعہ کی بنا پر واقعہ معراج کی عظمت کو جھٹلانا انصاف و دانشمندی کے تقاضوں کے منافی ہے۔

آیاتِ معراج کی تفسیر و توضیح

قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے کہ اے لوگو! سفر معراج کے دوران **ما ضل صاحبکم وما غوی** تمہارے آقا و مولا نہ بہکے اور نہ بھٹکے ہی بلکہ سارے سفر کو بڑی دلجمعی اور سکون کے ساتھ طے کیا جیسے پہلے ہی تمام مراحل و مدارج سفر سے آگاہ ہوں۔ پھر ارشاد فرمایا وما ینطق عن الھوی وہ رسول خداﷺ تو اپنی خواہش سے کچھ بولتا ہی نہیں بلکہ اس کی ہر بات سراسر وحی الٰہی ہوتی ہے۔ مزید ارشاد ہوا علمہ شدید القوی اس نے علم سیکھنے کے لئے کسی کے آگے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا بلکہ اس نے علم زبردست قوت رکھنے والے رب سے حاصل کیا۔ اسے علم اور اسرار الٰہیہ کے تمام خزانے براہ راست عطا کئے گئے۔ اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے معراج میں آپﷺ کی بلندی اور علو مرتبہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا وھو بالافق الاعلی وہ بلندیوں کی انتہا پر تھا۔ جس کے آگے کوئی کنارہ اور حد نہیں۔ جب خدا کی ذات اپنی صفاتی تجلیات کے ساتھ اس کے قریب آئی تو ثم دنی ارشاد ہوا اور پھر اس سے زیادہ قرب کو فتدلی کہہ کر ظاہر کیا۔ پھر ارشاد ہوا فکان قاب قوسین اوادنی یعنی پھر وہ اتنا قریب ہوا کہ دونوں کے درمیان دو کمان یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ قرب و وصال کی اس انتہائی منزل پر دونوں کی ملاقات ہوئی اور قرب کی اس انتہا کو پہنچ کر فاوحی الی عبدہ مااوحی اپنے خاص بندے کی طرف وحی کی جو کی۔ اس کی خبر وحی کرنے والے کو ہے یا اسے ہے جسے وحی کی گئی کسی اور کو اس کی کوئی خبر نہیں کہ راز و نیاز کی باتوں میں محبّ اور محبوب کے سوا کوئی تیسرا شامل نہ تھا۔ پھر فرمایا ما کذب الفواد ما رای اس رسول معظمﷺ نے جو کچھ بچشم سر دیکھا دل نے اس کے کو نہیں جھٹلایا یعنی دیدار خداوندی کے معاملے میں آنکھ نے جو کچھ دیکھا دل نے اس دیکھنے کی تصدیق کی اور ان کے بارے میں جو روایت میں جھگڑا کرتے ہیں، وعید فرمائی گئی کہ افتمارونہ علی ما یری تم اس بارے میں جھگڑتے ہو کہ اس نے کس کا دیدار کیا۔ پھر دیکھنا

صرف ایک بار نہ تھا ولقد راٰی نزلۃ اخری اس نے دوسری مرتبہ اسے دیکھا۔ یہ دیکھنا ایسا ہی تھا جیسے دم رخصت بچھڑنے سے پہلے کوئی محبوب کو مڑ مڑ کر دیکھتا ہے اور یہ دیکھنا عندھا جنۃ الماوی سدرہ المنتھیٰ کے قریب تھا۔ پہلی مرتبہ جلوہ محوب قاب قوسین پر دیکھا اور دوسری مرتبہ سدرۃ المنتھی پر جس کے قریب جنت الماویٰ ہے۔ جب منظر یہ تھا کہ اذ یغشی السدرۃ ما یغشی سدرہ کو ڈھانپنے والی چیزوں نے ڈھانپ لیا تھا۔ گویا فرشتوں کا انبوہ کثیر سدرہ میں حضور ﷺ کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ مازاغ البصر وماطغی یہ دیکھنا ایسا تھا کہ نہ اس کی آنکھ بھٹکی نہ جھپکی نہ حد سے بڑھی۔

احادیث معراج باہم متعارض نہیں:

واقعہ معراج کی تفصیلات جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ہزار ہا کتب احادیث میں بکھری پڑی ہیں۔ ان کا احاطہ کرنا ہر کس و ناکس کی بساط سے باہر ہے۔ اس کے لئے پورے ذخیرہ احادیث کا کھنگالنا ناگزیر ہے۔ اب اگر کوئی مطالعہ ناتمام کے باعث یہ کہنا شروع کر دے کہ فلاں حدیث میں بیان کردہ واقعہ فلاں حدیث سے متعارض ومتصادم ہے تو یہ اس کی کوتاہ بینی اور کم فہمی ہوگی کہ اس کی نظر سے پوری تفصیلات نہیں گزریں۔ ورنہ حقیقت میں کوئی روایت دوسری روایت سے متعارض نہیں ہے اور اگر کوئی تضاد بظاہر نظر آتا ہے تو وہ پوری تفصیلات پر دسترس نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔

واقعہ معراج کو کم وبیش اٹھائیس صحابہ وصحابیات رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اور بعض کے نزدیک چونتیس نے روایت کیا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں رقم کئے ہیں۔ مختلف علماء تفسیر نے ان راویان معراج کی تائید کی ہے وہ خوش نصیب صحابہ کرامؓ جنہوں نے واقعہ معراج خود حضور ﷺ کی زبانِ فیض ترجمان سے سنا ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

اختلاف روایات کا سبب:

واقعہ معراج کی روایات میں اختلاف کی توجیہہ ایک مثال پر غور کرنے سے بخوبی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ وہ یوں کہ فرض کیجئے ایک سیاح جہاں گرد اطراف واکناف عالم میں گھوم پھر کر وطن واپس لوٹا ہے۔ جس کے دوران قدرتی مناظر کے علاوہ اس نے کارخانوں، ملوں، سرکاری دفاتر، تعلیمی درس گاہوں غرضیکہ زندگی کے مختلف النوع شعبوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ اس عالمی مطالعاتی دورے (Study Tour) کے بعد کیا آپ اس سے توقع کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے ہر ملنے والے سے اپنے دورے کی جملہ تفصیلات من وعن بیان کر دے گا؟............نہیں بلکہ وہ ہر ایک سے اس کے ذوق، علمی استعداد اور سوجھ بوجھ کے مطابق بات کرے گا۔ اگر وہ کسی ایسے شخص سے ملاقات کرتا ہے جسے کسی ملک کی صنعتی ترقی میں دلچسپی ہے تو اس سے بات چیت میں وہ اس ملک کے کارخانوں، فیکٹریوں اور صنعتی، یونٹوں مزدوروں اور ان کے مسائل کا ذکر تفصیل سے کرے گا اور دوسری بہت سی باتیں جو غیر متعلقہ ہوں گی نظرانداز کر دے گا۔ اسی طرح ایک ماہر تعلیم تعلیمی درس گاہوں، لائبریریوں اور مختلف شعبہ ہائے تعلیم کے اساتذہ کے بارے میں معلومات فراہم کرے گا۔ کسی ڈاکٹر سے بات چیت میں وہ وہاں کی ڈسپنسریوں، ہسپتالوں اور مروجہ طریقہ ہائے علاج کا ذکر کرے گا اور دیگر غیر ضروری باتوں کے تذکرے سے اجتناب کرے گا۔ الغرض ہر ایک سے اس کی گفتگو کا دائرہ اس کے ذوق اور دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے بدلتا رہے گا اور ہر مجلس میں وہ کوئی نئی سے نئی بات کا تذکرہ کرے گا۔ چنانچہ اگر مختلف افراد اس سے مختلف موضوعات پر انٹرویو کریں تو ان کی بیان کردہ بہت سی باتوں کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا بعید از قیاس نہیں۔ ہر ایک اپنی عقل اور سوجھ بوجھ کے مطابق واقعات اس سے منسوب کرے گا اور ان میں اختلاف کا در آنا کوئی غیر فطری بات نہ ہوگی۔

اس فرضی تمثیل سے واقعہ معراج کے بارے میں جو اختلاف بادی النظر میں دکھائی دیتے ہیں ان کی حقیقت غور کرنے سے عیاں ہو جائے گی۔ حضور اکرم ﷺ نے واقعہ معراج کی تفصیلات بیسیوں صحابہ کرامؓ سے بیان فرمائیں۔ کفار مکہ کو بھی اس واقعہ سے آگاہ کیا گیا لیکن انداز بیان اور تفصیلات کی نوعیت موقع محل کے مطابق جدا جدا ہوتی ہے۔ کفار و مشرکین سے واقعہ معراج کا ذکر کرتے ہوئے ان سے بیت المقدس کے سفر کی جزئیات بیان کر دی جاتیں اور مالاء الاعلیٰ اور دیگر آسمانی مشاہدات کو عمداً نہ بیان کیا جاتا۔ عام صحابہ کرامؓ سے معراج کی تفصیلات ان کی ذہنی استعداد کو پیش نظر رکھ کر بیان کی جاتیں لیکن اگر ذکر معراج چہار یار سے چھڑ جاتا تو انہیں بہت سی ایسی راز و نیاز کی باتوں سے آگاہ کر دیا جاتا جو سر مجلس نہ کی جاتیں۔ یہ اپنے اپنے ظرف کی بات تھی کہ کسی کو پہلے آسمان اور کسی کو ساتوں آسمان کی باتیں بتا دی جاتیں۔ بعض شناسائے حریم نبوت ایسے بھی تھے جنہیں سدرۃ المنتھیٰ اور قاب قوسین کے اسرار و رموز سے بھی آگاہ کر دیا جاتا۔ اس سے مترشح ہوا کہ نکات معراج ہر ایک کی اقتضائے طبیعت کو دیکھ کر بیان کئے جاتے تھے۔

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

اسی طرح واقعہ معراج کی تفصیلات بیان کرنے والے راویوں نے اپنے اپنے فہم اور نقطہ نگاہ سے واقعہ معراج کو روایت کیا۔ یہی وجہ ہے کہ واقعہ معراج کی کڑیاں کبھی تو ایک دوسرے سے ملتی نظر آتی ہیں لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا چکا ہے یہ اس لئے ہے کہ ہمارا علم محدود اور غیر مکمل ہے۔ مختلف احادیث کو ایک دوسرے سے متعارض قرار دینے والے کسی نام نہاد تضاد کو رفع کرنے کی سعی نا مشکور میں اس حد تک آگے نکل جاتے ہیں کہ واقعہ معراج کی عظمت ہی مجروح ہو کر رہ جاتی ہے۔